آنچل
PDFBOOKSFREE.PK
احمد ندیم قاسمی

اختر شیرانی

کے نام

جن کی شخصیت ان کی شاعری

سے بھی دلچسپ اور پیاری ہے

ندیم

ترتیب

1 دیباچہ
2 جان ایمان کی خیر
3 نشیب و فراز
4 خربوزے
5 نامرد
6 سائے
7 حدِّ فاصل
8 انصاف
9 مہنگائی الاؤنس
10 سانولا
11 شعلۂ نم خوردہ

دیباچہ

"آپ کے افسانے کا بنیادی خیال کیا ہے؟" —— "آپ ایک ہی موضوع پر لکھتے لکھتے اکتا نہیں جاتے؟" —— "آپ افسانوں میں شاعری کیوں کرتے ہیں؟" "آپ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ترقی پسند افسانے نہیں لکھتے' یہ بری بات ہے۔" "آپ اچھے افسانہ نگار نہیں۔" —— "آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں" —— "آپ انسان کے آنسوؤں اور بارش کے جھالوں کو ہم آہنگ نہ کیا کریں' فطرت بڑی بے درد ہے" —— "آپ افسانے میں تھیم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں یا پلاٹ کو؟" —— "آپ نے جدید افسانے کی تکنیک پر کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ ——"

ہر افسانہ نگار کی زندگی میں اس قسم کے سوالات کو بہت دخل رہا ہے لیکن ایک صاحب کے سوال سے تو میں ایک روز چونک پڑا۔

"آپ افسانہ کیوں لکھتے ہیں؟"

اس سوال نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ واقعی میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں' آخر اَدب کی بے شمار دیگر اصناف بھی تو ہیں۔ اس سوال کا جواب دینا کچھ ضروری نہ تھا۔ کیونکہ سوال پوچھنے والے صاحب افسانہ نگار نہیں تھے——

یعنی ان کے دماغ میں "فتور" نہیں تھا۔

——— اور یہاں——— یہاں تو یہ دنیا' یہ انسان' یہ موسم' یہ رات دن کے چکر سب کو مقررہ اقدار سے الگ ہو کر دیکھا جا رہا تھا۔ یہاں تو یہ کوششیں جاری تھیں کہ یہ ایک پگڈنڈی پر جاتا ہوا اکیلا نوجوان اگر آس پاس بکھرے ہوئے کھیتوں کو نہیں دیکھتا' تو کیوں نہیں دیکھتا' اور اگر دیکھتا ہے تو متاثر کیوں نہیں ہوتا۔ اور اگر متاثر ہوتا ہے تو اس تاثر میں تھکن اور ماندگی کیوں ہے——— اور پھر یہ نوجوان جو تحصیلدار صاحب کا چرمی صندوق اور خوبصورت ہولڈال اٹھائے ہوئے ہے' یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اسے اس مشقت کی کوئی اجرت نہیں ملے گی۔ اسے یہ سامان فرش پر پٹخ کر اور اکڑ کر کہنا چاہئے۔ "میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں' اور انسان' انسان کا غلام نہیں رہ سکتا۔ یہ تخلیق کے مقاصد کے منافی ہے" ——— اور یہ لڑکی جو کنواری ہے مگر کنواری نہیں لگتی' گلی کے نکڑ پر رک کر سبزی بیچنے والی بڑھیا سے یہ کیوں پوچھ رہی ہے۔

"خالہ آج کل ہر چیز مہنگی کیوں ہو رہی ہے؟"

اور قریب کی ایک چھت پر ایک نوجوان کھنکار کر یہ کیوں کہتا ہے۔

"جنگ کا زمانہ ہے نا۔"

یہاں تو گھورے پر پڑے ہوئے اس چیتھڑے کی "تاریخ" پر غور کیا جاتا ہے' جو کرسی نشین صاحب کے دالان سے کوڑے کے ساتھ آگرا ہے ——— اور پھر ایک دہقان کی سفید قمیض میں سیپ کے بٹن سرخ دھاگے سے سلے ہوئے——— اور فصلوں کی بری حالت کے باوجود تھانیدار کی گھوڑی کے اکڑے ہوئے پٹھے جنہوں نے گوشت کے گدگدے لوتھڑوں کو جکڑ رکھا ہے' اور یہ ادھیڑ عمر کی عورت جو آج خلافِ معمول غروب آفتاب سے قبل ہی گھر

کے کام کاج سے فارغ ہو چکی ہے اور ہاتھ منہ کو انگریزی صابن سے دھو رہی ہے——— اور یہ موچی جو پٹواری کا جوتا تیار کرتے وقت ہر ٹانکے کے بعد کہتا ہے——— "ہت تیری پٹوارن"——— وغیرہ وغیرہ۔

یہ دماغی "فتور" کے ثبوت ہیں لیکن آخر اس دیوانگی اور سودائی پن کی نشر و اشاعت کے لیے افسانہ کیوں؟

جواب سوجھا ہے' لیکن میرے ترقی پسند دوستوں کی توقعات کے قطعاً خلاف! یہاں پھر شاعری آدھمکی ہے——— یعنی وہ احساسِ لطافت ——— وہ گدازِ روح——— جس کے بغیر نہ خدا کا تصور کیا جاسکتا ہے' نہ کائنات کا' نہ آدم کا اور نہ اولادِ آدم کی ننھی خوشیوں اور ہمالوی دکھوں کا۔

"میں پھولوں کے انبار کو پسند نہیں کرتا۔ گلدستوں میں پتیوں' کے مڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ میں ستاروں کے جمگھٹ کو پسند نہیں کرتا' اس طرح نگاہیں بھٹک جاتی ہیں۔ میں انسانوں کے ہجوم کو پسند نہیں کرتا' کیونکہ ہجوم کا تصور صرف قیامت سے متعلق ہے——— مجھے ایک پھول' ایک ستارہ' ایک انسان چاہیئے——— اور اس وحدت کو صرف افسانہ ہی سہارا دے سکتا ہے۔ میں ایک پھول کی پنکھڑیوں کا ذکر کروں گا' تو سب پھولوں کی نمائندگی ہو جائے گی۔ میں ایک ستارے کی پرواز کا حال بتاؤں گا تو سارے نظام شمسی کی سیمابی سرشت کا احساس مکمل ہو جائے گا۔ میں ایک انسان کو اپنے فن کا مرکز بناؤں گا تو ہبوطِ آدم سے لے کر موجودہ دور تک کا انسانی سفرنامہ سامنے آجائے گا' مجھے وحدت سے محبت ہے' نقادوں کی زمانی اور مکانی وحدتیں

میرے نزدیک محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ مجھے ایک خدا
چاہیئے اور ایک کائنات اور ایک انسان۔ متفق اور مجتمع!"
اور اسی لیے میں افسانہ لکھتا ہوں!

جس وقت میرے احساس و شعور نے افسانے سے کوئی بہتر صنف ایجاد کی، تو میں خود بخود اپنا راستہ بدل لوں گا۔ فی الحال بحیثیت نثرنگار مجھے افسانے سے بہتر کوئی ایسا ذریعۂ اظہار میسر نہیں آسکا یا سوجھ نہیں سکا، جو زندگی کے مختلف رنگ پیش کرنے میں میرا معاون ثابت ہو۔

لیکن یہ میرے افسانوں کے رنگ ڈھنگ —— آخر میری کہانیاں دورِ جدید کے سانچوں میں ڈھل کر کیوں نہیں نکلتیں؟ —— میں نفسیات کی ایک گتھی پر صفحوں کے صفحے کیوں سیاہ نہیں کرتا؟ میں "فیشن ایبل" اندازِ بیان سے کیوں احتراز کرتا ہوں؟ اپنے تمام نوجوان دوستوں کے افسانوں سے میرے افسانے مختلف کیوں ہوتے ہیں؟ یا بقول کسے "پیچھے کیوں ہیں؟"

تو بات یہ ہے کہ میں اپنے ذہن، اپنے تصور اور اپنے عقیدے سے ریاکاری برتنے کا قائل نہیں۔ اپنے افکار کا وزن معلوم کرنے کے لیے میرا احساس ہی بہترین ترازو ہے۔ اگر میری کوئی تکنیک ہے تو وہ محض خلوص ہے۔ اگر میرا کوئی موضوع ہے تو وہ محض انسانی زندگی ہے۔ اگر میرا کوئی اسلوب ہے تو وہ محض میری شاعرانہ افتادِ طبع کا پرتو ہے —— بغیر کسی قسم کی خودستائی کے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں فنکار ہوں اور میں فن کو اصطلاحات کا اسیر نہیں بنانا چاہتا۔ اس جبرکدے میں دوسری خامیاں کیا کم ہیں، کہ اتنی پاکیزہ نعمت کو بھی لاٹھی کے سہارے گھسیٹتا پھروں۔

وقت بہترین نقاد ہے، اور میں اپنی ادبی کاوشوں کو وقت کے حوالے کرتا ہوں، اگر ان میں کوئی جوہر ہے تو دنیا کی کوئی قوت ان کی تابانیوں کو نہ

چھین سکے گی اور اگر یہ محض ذہنی آوارگی کی پرچھائیاں ہیں، تو یہ خود بخود مٹ جائیں گی، اور اُس وقت میں کسی بیرونی قوت کو متہم گردانے بغیر ہی کہوں گا کہ میرا خلوص بے لوث نہ تھا۔

ندیم
میو روڈ —— لاہور
10/ مئی 1944ء

جان ایمان کی خیر

سورج مغربی افق کو مس کرتے ہی سونے کی طشتری بن گیا۔ یہ طشتری ہولے ہولے کھسکتی سنہری کہرے میں ڈوب گئی اور کائنات نے جماہی لی۔ مشرق سے نیندوں کی پریاں اپنے مشکیں پروں پر تیرتی مغرب کی طرف بڑھیں اور چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی بانو نے آواز دی۔

"آج آپ کے بستر کی چادر بدلنی ہوگی۔"

دواؤں کے بھبکے میں لپٹی ہوئی چادر نے میرے نحیف جسم کے نیچے شکنوں کی جالی سی کاڑھ رکھی تھی اور تکیہ پر روغن بادام اور گرد و غبار نے گھل مل کر ایک عجیب پلپلے سے کیچڑ کی تہ ابھار دی تھی۔ جھٹپٹے کی اداسی نے میرے اعضاء پر غنودگی سی طاری کر دی تھی۔ میں کروٹ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"کل صبح بدلیں گے۔ بیماروں کے بستر سویرے ہی بدلے جاتے ہیں۔"

وہ توے پر جمی ہوئی گلی سڑی تہوں کو چمٹے کی نوک سے کھرچتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے، پر صبح کو اکا دکا پڑوسی آنکلتا ہے نا۔ دوسروں کے سامنے

چادر کو بدلا جائے تو نیچے سے گودڑ سی توشک دیکھ کر وہ کیا خیال کریں گے ہمارے متعلق؟ ——"

"پر مجھ سے اب بستر پر سے نہیں اٹھا جائے گا۔" میں نے کروٹ مکمل کر لی تھی۔ وہ انگلیوں پر سے آٹے کی مروڑیاں اتارتی میرے پاس آگئی۔ چولھے کی آنچ نے اس کے گالوں پر گلال پھیر دیا تھا۔ سیاہ بال راکھ کے ذروں سے بھورے ہوگئے تھے۔ اور اس کے گریبان کے ایک بٹن کی بجائے خلاف معمول دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ میرے ماتھے پر اپنے دوپٹے کا پلو رکھا اور پھر اس پر ہاتھ دھر کر محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"میں آپ کو پھول کی طرح اٹھا کر ساتھ والی کھاٹ پر ڈال دوں گی۔ آنکھ کی جھپکی میں چادر اور تکیہ بدل کر پھر آپ کو پلنگ پر لٹا دوں گی۔ اس کے بعد آپ کی پنڈلیاں اور پیر اور پیٹھ دباؤں گی۔ آپ کے محبوب شاعروں کے گیت سناؤں گی۔"

"گا کر؟" میں بچوں کے سے بھولپن سے بولا۔

"جی ہاں! گا کر سہی۔" اس نے میرے ماتھے کو دبایا۔ "اگر میری سہیلی خاتون، وہ بوڑھے درزی کی لڑکی —— آنکلی تو اسے کہوں گی، تو کٹورا بجا، میں گاتی ہوں۔ وہ کٹورا بجائے گی، میں گاؤں گی اور پھر ایسی غزلیں سناؤں گی آپ کو، کہ آپ سو جائیں گے اور صبح تک سوتے رہیں گے اور میں آپ کے پنکھا جھلتی رہوں گی۔ آپ کی چادر کی شکنیں ——" اور وہ اچانک اپنا ہاتھ کھینچ کر چولھے کی طرف لپکی اور چلّائی "جل گئی۔"

سڑے ہوئے اناج کی بو سے صحن لبریز ہوگیا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"کیا ہوا؟ روٹی جل گئی؟ کوئی بات نہیں، اور سہی۔ وہ بھی جل جائے تو اور سہی، اور اگر وہ بھی جل جائے تو ——"

"آپ تو مذاق کرتے ہیں۔" وہ بولی۔ "جنگ کا زمانہ ہے۔ ایک روٹی کا جل جانا ایک کھلیان کا راکھ ہو جانا ہے۔ سچ کہتی ہوں، بڑا غضب ہوا۔"

میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اور اس کے ہاتھوں کو اپنے کمزور زرد اور کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"روٹی جل گئی تو کیا ہوا۔ سگھڑاپا حد سے بڑھے تو کنجوسی کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ تم نے میٹھی میٹھی باتیں کر کے میرے زخموں پر جو پھاہے رکھے ہیں، ان کے مقابلے میں یہ چھٹانک بھر آٹا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ —— بانو —— ! تم نہ ہوتیں، تو جانتی ہو اس حالت میں مَیں کیا کرتا؟"

"کیا کرتے آپ؟" وہ پلنگ کے بازو پر بیٹھ گئی۔

میں نے پپوٹے جھکا کر آنکھوں کو خواب آلود بناتے ہوئے کہا۔

"مُیں یہاں سے کسی بہانے نکل جاتا۔ اور وہ سب سے اونچی گگر ہے نا گاؤں کے پچھم میں —— گونجن نالے کی پرلی طرف —— وہاں سے چھلانگ لگا دیتا نیچے کھڈ میں —— میرا بھیجا ایک چٹان پر ہوتا تو میری انتڑیاں دوسری چٹان پر، اور میرے لہو اور ہڈیوں کے گودے سے آس پاس کے کنکر ——"

اس نے بلکتے ہوئے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہیئے، ایسا نہ کہیئے۔"

وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ میں زور زور سے ہنسنے لگا اور اس کے رونے اور میری ہنسی کے امتزاج سے ایسی آوازیں بلند ہوئیں، جیسے کانسی کی بہت سی گاگریں تالاب کے پانی میں ہولے ہولے ڈوبی جا رہی ہوں۔

پرائمری اسکول کے استاد کا بیمار ہو جانا اس لحاظ سے بے حد دردناک ہوتا ہے کہ اسے چھٹی نہیں ملتی۔ رخصت کی درخواست لکھتے وقت ہیڈ ماسٹر کے

یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ "بیمار ہو تو پڑے ہوا کرو، محکمہ کی بلا سے۔ نوکری کرنی ہے تو سیدھے سیدھے مدرسے چلے آؤ، ورنہ تنخواہ کاٹ لی جائے گی۔"

پرائمری مدرسے کے منشی کی تنخواہ کاٹ لینے سے اول تو یہی بہتر ہے کہ اس کا گلا کاٹ لیا جائے، اور اگر گلا کاٹنے والے کو قانونی گرفت کا ڈر ہو تو سرے سے نام ہی کیوں نہ کاٹ دیا جائے منشی جی کا —— گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا جا چکے تو نیچے سے تختے فوراً سرکائے جاتے ہیں۔ موت اور زندگی کے درمیان معلق رکھنے کی سزا تو شاید وحشی قوموں کے نزدیک بھی روا نہ سمجھی جاتی ہو گی۔

اگر مجھے دق کا مرض ہوتا تو شاید میں نام کٹوانے کی بھی کوشش کرتا۔ پر مجھے تو کوئی عجیب سا نجار تھا۔ ہلکا ہلکا اور میٹھا میٹھا۔ کانوں میں گونج سی، جیسے دور کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ آنکھوں میں جلن سی، جیسے بہت دیر تک کسی خوبصورت چیز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ کھانسی نام کو نہ تھی۔ اعضا میں ایک غنودہ سا کسل بھر جاتا۔ رگوں میں اینٹھن سی ہوتی۔ گردن کے پٹھے تن جاتے اور مجھے اتنی انگڑائیاں آتیں کہ میرا بند بند دکھنے لگتا۔ خود بانو نے ایک دن کہا تھا۔

"دق؟ —— آپ نے دق کا نام کیوں لیا —— دق والے تو یوں ہو کر رہ جاتے ہیں ——" اس نے مجھے ایک جلی ہوئی لکڑی دکھائی تھی اور میرے شانوں کو دبا کر بولی تھی "اور آپ تو اللہ کے فضل سے بالکل تندرستوں کی طرح ہیں۔"

تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کرنے کا شوق تو تھا لیکن مہینے کے انیس بیس دن گزر جانے کے بعد بانو کے بکس میں کپڑوں کے تلے سے کاغذ کا آخری

چھلکا نکال لیا جاتا اور پھر جب حق و باطل کا علم بلند کر کے براعظم آپس میں ٹکرائے تو پس انداز کرنے کا سوال ہی اٹھ گیا۔ اب تو صرف پیٹ بھر کر کھانے کی فکر تھی۔ جس روز تازہ تازہ تنخواہ ملتی، بانو اور میں بڑا جشن مناتے۔ دو تین قسم کے کھانے پکتے۔ پڑوس سے گراموفون منگوا لیا جاتا اور چونکہ بانو پڑھی لکھی تھی اس لیے غالب اور فانی کی غزلیں گائی جاتیں، ہولے ہولے کانسی کے کٹورے اور مٹی کی گاگریں بجائی جاتیں۔ بانو کی سہیلی خاتون درزن ہوائی دوہے الاپتی۔ پڑوس کی چھتوں پر ننھے ننھے لڑکے اور لڑکیاں ٹھوڑیوں کو ہتھیلیوں میں جمائے دیر تک بیٹھے رہتے۔ چوپال پر بیٹھا ہوا نمبردار ٹھڈی پر اُگے ہوئے گنتی کے چند بالوں کو کھجلا کر کہتا "منشی کو تنخواہ مل گئی، گھڑا بج رہا ہے!" —— اور پھر کچھ دنوں کے بعد وہی پیاز کی اشک آور تہیں اور وہی چنوں کی پھپھسی دال، جن میں بناسپتی گھی متعفن انڈے کے لیس دار لعاب کی طرح تیرتا رہتا۔

شاید یہ ناکافی اور ناواجب غذا ہی کا اثر تھا کہ اول اول میرے اعضاء ٹوٹنے لگے اور پھر بخار نے آلیا۔ پندرہ دنوں کی رخصت لے کر دیسی دواؤں کے جوشاندوں پر گزر کی۔ حلق چھل گیا لیکن بخار نہ ٹلا۔ آخری چھٹی کے روز قصبے میں ڈاکٹر کے ہاں مشورے کے لیے گیا۔ معلوم ہوا کہ اس مقصد کے لیے وہ پانچ روپے پیشگی لیتے ہیں—— اگر میرے پاس پانچ روپے ہوتے تو جوشاندوں ہی کا سلسلہ جاری رکھتا۔ یہاں تو خیراتی ہسپتال کی خبر سن کر ڈاکٹر سے مشورے کی دھن سمائی تھی۔ گاؤں واپس آکر میلے سے تولیے میں دو کپڑے لپیٹے اور اسکول جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ بانو آنکھوں میں آنسو بھرے دہلیز پر کھڑی مجھے ٹک ٹک گھور رہی تھی۔ میں رخصت ہونے لگا تو کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ نوکری ہے یا بیگار؟ انسان نوکری کرتا ہے آرام کی خاطر، اور

یہاں بخار میں بھی مدرسے جانے کی کڑی پابندی ہے۔ بہتر ہے اب کے چھٹی نہ ملے تو استعفے دے دیجئے گا۔"

"کھائیں گے کہاں سے؟" میں نے گٹھڑی گھماتے ہوئے کہا۔

"اللہ دے گا۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

اور میں نے مسکرا کر کہا۔ "پر اللہ یونہی تو نہیں دیتا۔ ایسا بھولا تو وہ بھی نہیں کہ ہاتھ پیر بھی نہ ہلاؤ اور کھاؤ بھی خوب ٹھونس ٹھانس کر——" میرے دماغ میں مسئلۂ قضا و قدر کی کڑیاں چھنچھنانے لگی تھیں۔

لیکن وہ منطق اور دلیل کو جڑ سے کاٹ دینے والے یقین سے بولی۔

"وہ یقیناً دیتا ہے، اسے اپنے فرائض کا احساس ہے، وہ اگر یوں ہاتھ کھینچ لے تو آدم کی نسل سوکھے سڑے ڈھانچوں، اور نچے کھچے پنجروں کا——"

"جانے بھی دو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" میں نے گٹھڑی کو کاندھے پر لٹکایا اور اس کے گالوں کو تھپتھپا کر کہا "دعا کرنا—— کرو گی نا؟"

اور وہ دونوں ہاتھوں سے بھیگے ہوئے چہرے کو چھپا کر دھم سے دہلیز پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "فی امان اللہ۔"

جب میں اسکول پہنچا تو کمر دکھ رہی تھی اور پنڈلیوں کے ڈھیلے ڈھالے پٹھوں میں بے ہنگم تناؤ سے لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ ننھے شاگرد میرے آس پاس اکٹھے ہوگئے۔ "ماسٹر جی آگئے، ماسٹر جی آگئے——" وہ ناکیں سڑسڑاتے، تالیاں پیٹتے، تختیاں بجاتے چیخنے لگے اور میں نے انہیں اپنی اپنی جگہ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "بڑے ماسٹر جی نے یہ باتیں سن لیں تو جانتے ہو ان کا مولا بخش سَن سے اٹھتا ہے اور ٹھن سے پڑتا ہے۔"

"وہ تو کل ٹوٹ گیا تھا۔" ایک لڑکا بولا۔ "شام لال کو مار پڑی کسی

ہڈی پر لگ کر دو ہو کے رہ گیا۔"

اچانک مجھے ساتھ کے کمرے سے ایک لڑکے کی چیخیں سنائی دیں۔ کھڑکی میں سے دیکھا تو ہیڈ ماسٹر شام لال کے چٹکیاں لے رہا تھا اور چٹکی کے ساتھ ہونٹوں اور بھوؤں کو بل دیتے ہوئے پکارتا تھا۔ "ادھر میری سونٹی ٹوٹی اور ادھر تمہیں کھیل کھیلنے کی سوجھی' پاجی کہیں کے'——وارث——ابے او بڑھئی کے بچے'—— کہہ دیا تھا نا اپنے باپ کو نئی سونٹی کے لیے——اچھا—— تو اب بتا شامو کہاں ہے تیری نئی کاپی—— کہاں ہے؟ —— نہیں ہے نا؟ —— تو لے—— ایں ں ں ں ں ں یہ لے!" —— اب کے شام لال خوفناک چٹکی کو برداشت نہ کرسکا۔ بلسینیاں لے کر تڑپا اور ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں لٹک سا گیا۔ ہیڈ ماسٹر کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو دھم سے منہ کے بل گر پڑا' بے حس و حرکت—— بے جان—— جیسے مردہ کتورا!

مدرسے میں کھلبلی مچ گئی۔ میں شام لال کو جانتا تھا۔ وہ ایک غریب دکاندار کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی اس لیے باپ چڑچڑے مزاج کا ہو گیا تھا۔ میں دوڑا دوڑا اندر گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھے دیکھا تو بولا۔ "اچھا تو آ گئے آپ؟ خوب! اس وقت کتنا بخار ہے آپ کو؟ آپ تو سوکھ کر کانٹا ہو گئے بالکل—— میں سوچ رہا تھا کہ ماسٹر صاحب آئیں تو انہیں مشورہ دوں کہ یہ ذلیل نوکری چھوڑ چھاڑ کر اپنی نوابی چلائیے۔ باغیچوں میں دندنائیے' گدیلوں پر سوئیے اور عیش کیجئے' یہاں کیا دھرا ہے آپ کی دلچسپی کے لیے؟ یہی سوائے' پونے اور ڈھونچے کے پہاڑے اور بہتی ہوئی ناکوں والے بچے اور مجھ ایسا بدمزاج ہیڈ ماسٹر!"

اور جب اس نے شام لال کو پانی کے وحشیانہ چھینٹوں سے ہوش میں آتے دیکھا تو بولا۔ "اب اٹھاؤ بھی اس مردود کو—— پڑا کراہ رہا ہے لاڈلا

—— مکار' ریوڑیاں کھا لیتے ہیں' کاپی نہیں خرید سکتے۔ —— ہاں تو ماسٹر صاحب کیا صلاح ہے آپ کی؟ آپ یہاں نوکری کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ سیدھی بات کیجئے—— میرا سکول تباہ ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "حضور! آپ میرا چہرہ تو دیکھیں اور یہ میری پنڈلیاں اور یہ باہیں اور اتنی سی گردن اور——"

ہیڈ ماسٹر نے میری بات کاٹ لی۔ "آفرین ہے آپ پر—— باہیں اور پنڈلیاں تو دکھا دیں۔ اب لگے ہاتھوں اپنے ان روحانی فرزندوں کے سامنے دھوتی بھی اتار دیں تاکہ یہ اچھا سبق سیکھیں۔ ماسٹر صاحب! آپ کی ذات کیا ہے؟"

شام لال رینگتا ہوا بوری کے پھٹے پرانے ٹکڑے پر یوں جا بیٹھا تھا جیسے بلی کا شکست خوردہ بلونگڑا۔ لڑکے اب مجھے گھور رہے تھے اور میں حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے میں ان دیکھی راہوں پر گھوم رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے میری ذات پوچھی تو اچانک یہ اندھیرے چھٹ گئے اور جگمگاتے افق سے میرا ضمیر پکارا اور میری زبان نے میرے ضمیر کی ترجمانی کر دی۔ "آپ میری ذات پوچھتے ہیں' میں انسان ہوں—— سمجھے آپ؟ اور یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ مجھے آپ ایسے حیوان کے تحت کام کرنا پڑا۔ مجھے اس ملازمت کی ضرورت نہیں' جہاں انسان جوتا بن کر رہ جائے۔ جب چاہا پہن لیا' جب چاہا اتار پھینکا' جب چاہا——"

ہیڈ ماسٹر لال پیلا ہو کر چلایا: "خاموش۔"

لڑکے کانپ کر کتابوں پر جھک گئے۔ پرلی طرف سے ایک استاد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ شام لال اپنے بستے سے ایک بوسیدہ کتاب نکال کر ورق الٹنے لگا اور باہر بیٹھے ہوئے میرے ننھے شاگرد گردنیں بڑھا بڑھا کر میری طرف

دیکھنے لگے۔ میں پلٹ کر ان کے پاس آیا۔ استعفیٰ لکھا اور ہیڈ ماسٹر کی میز پر رکھ دیا۔

استعفیٰ کی منظوری کے انتظار میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں کئی مرتبہ بخار ہوا' کھانسی بھی آنے لگی۔ سینے میں گاہے گاہے ہُوکیں اٹھنے لگیں۔ ایک ذریعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہیڈ ماسٹر میرے جانے کے بعد مدرسے کی عمارت کو فینائل سے دھلائے گا۔

آٹھویں روز منظوری آگئی اور جب میں چند رجسٹر ہیڈ ماسٹر کے حوالے کر کے اٹھا تو دوسرے اساتذہ بھی ہیڈ ماسٹر کے خوف سے میرے نزدیک نہ آئے۔ میرے شاگردوں میں سے چند ایک نے پوچھا۔—— "ماسٹر جی پھر چھٹی؟"

میں نے کہا "ہاں —— بڑی ضروری چھٹی ہے ——" اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر جب میں سکول کے احاطہ سے باہر جانے لگا تو دور سے ہرکارے نے ہانک لگائی۔

"آپ کا ایک خط ہے ماسٹر جی —— وہ ٹیڑھے میڑھے موٹے موٹے حرفوں والا خط!"

یہ بانو کا خط تھا۔ میرے رخصت ہونے کے تین روز بعد اس کی ماں میری عیادت کو آئی تھی اور اسے بڑی منّتوں کے بعد اپنے ہمراہ لے گئی تھی —— مجھ سے استدعا کی گئی تھی کہ میں دھرپورہ سینی ٹوریم میں داخل ہو جاؤں' کیونکہ میں بانو کی ماں کے خیال میں مدقوق تھا۔ اس سلسلے میں رقم کی فراہمی کے لیے مکان کو بیچ ڈالنے کی صلاح دی گئی تھی اور ساتھ ہی مجھے تسلی دی گئی تھی کہ مجھے تنہائی محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔ بیماری میں یونہی ہوتا ہے اور یہ کہ مکان کی چابی دکھنی منڈیر کے سب سے اونچے سوراخ میں ایک چیتھڑے میں لپٹی پڑی ملے گی۔

بخار سے جلا بھنا جب میں گھر پہنچا اور دکھنی منڈیر کے سب سے اونچے سوراخ سے چیتھڑا نکالا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے گزرے ہوئے زمانے کی نعش اپنی انگلیوں میں تھام رکھی ہے۔ گھِسی ہوئی چابی جو بانو کی انگلیوں میں تارے کی طرح چمکتی تھی' اپنی خنکی سمیت جیسے میرے تپتے ہوئے جسم میں رینگ کر دل و دماغ میں اچھلنے لگی' اور میری امیدوں کے پٹ کھٹ سے کھل گئے۔ بانو کو صرف صحت مند انور خان سے محبت تھی اور مریض انور خان تو کوڑھی ہے' کمین ہے۔ میرے پھیپھڑوں میں میٹھی یادیں پھڑ پھڑائیں اور میری نبضوں میں بیتے ہوئے لمحے ناچنے لگے۔

دھم سے میں ایک کھاٹ پر گر گیا۔ گھبرا کر اٹھا' دیوار کے ساتھ بانو کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا اور قفل میں پھنسی ہوئی چابی پر ایک بھڑ بیٹھی اپنے پر سنوار رہی تھی۔ باہر گلی میں بھیڑوں کا ایک ریوڑ ممیاتا ہوا گزر رہا تھا اور چرواہا چلا رہا تھا "تمہاری ماں مرے' یہ تنگ گلی ہے تنگ گلی۔ ایک ایک کر کے گزرو —— پھنس کر کھڑی ہوگئیں کمبختیں' چھینک رہی ہیں' ہانپ رہی ہیں' پر ہلتی نہیں —— ٹھس ٹھسا کر کھڑے ہونے میں تمہیں مزا آتا ہے' ہیں؟ ——" اور پھر پھٹ سے ایک لاٹھی پڑی اور گلی میں بھگدڑ مچ گئی' بھیڑیں تنگ کوچے سے نکل گئی تھیں اور گلی سنسان ہو گئی تھی —— میرے دل و دماغ کی طرح اجاڑ اور چپ چاپ' غبار آلود اور متعفن' خاک پر ماضی کے نقشِ قدم' جن کو شام کی نرم رفتار ہوائیں آہستہ آہستہ مٹا رہی تھیں۔

لیکن بانو کی گذشتہ محبت اتنی گہری اور سحر اثر تھی' اور پھر نوکری چھٹ جانے کا دکھ اتنا سخت تھا کہ میں نے بہت جلد شکوک و شبہات کے غبار اڑا دیئے اور دوسرے روز بخار کی شدت میں اسے ایک مفصل خط لکھا۔ جس کا

خلاصہ یہ تھا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے دق نہیں، موسمی بخار ہے اور اگر مجھے دق بھی ہو، تو بھی تمہارا میرے پاس موجود رہنا کتنا ضروری ہے۔ تم خط ملتے ہی چلی آؤ۔ منگل کے روز میں شام کوٹ کے اسٹیشن پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

ان دنوں مجھے ایک ہفتے میں سات دنوں کی بجائے سات سالوں کا تجربہ ہوا۔ منگل کے روز سورج کو جیسے مشرقی غار میں کسی قوت نے جکڑ لیا، پو پھٹی اور پھر پھٹتی ہی رہی۔ موذن کی آواز میں شک سا لرز رہا تھا، جیسے ابھی صبح ہوئی ہی نہیں، اور جب دکھنی منڈیر پر سونا پھر گیا اور چڑیاں خلاؤں میں بکھر گئیں تو میں لاٹھی ٹیکتا اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اس روز مجھے بخار بھی نہیں تھا اور سینے کی جلن تو جیسے کبھی ہوئی ہی نہیں۔ ایک سنسان گلی کے نکڑ پر مجھے بانو کی نوجوان سہیلی خاتون درزن ملی۔ سر پر سرسوں کے ڈنٹھل، ایک ہاتھ میں سرسوں کے پھول، کھدر کی رنگ برنگی اوڑھنی، ایڑیوں تک لٹکتی ہوئی، اور چولے کے بٹن تنے ہوئے بولی۔

"ارے منشی انور خان! تم یہیں ہو؟ بانو تو کہہ رہی تھی، تم اُدھر لاٹ والے شہر میں ہو، بڑے ہسپتال میں۔"

میں نے کہا "بڑے ہسپتال میں جی نہیں لگا، اس لیے لوٹ آیا۔ اور میں اب اچھا بھی ہوں۔ بابا کی صحت تو ٹھیک ہے؟"

سرسوں کے پھولوں کو گالوں پر پھیر کر بولی۔ "دعائیں دیتا ہے۔ جان ایمان کی خیر ہو۔ اللہ کرے تم جگ جگ جیو، ہم غریب بیچارے صرف دعا ہی تو مانگ سکتے ہیں!"

میں نے کہا "جیتی رہو۔"

بولی۔ "تم جیو، میں نگوڑی کیا کروں گی جی کر؟"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

مسکرا کر بولی "بس——!" اور اس نے سرسوں کے پھولوں میں اپنی ٹھوڑی رکھ کر مجھے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ سرمئی پپوٹے پتلیوں پر جھک آئے، اور چولے کے بٹن تو جیسے تڑاق سے ٹوٹنے کے لیے ایک لمبی سانس کے منتظر تھے۔

"کہاں چلے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے لاٹھی کو ایک پتھر سے بجاتے ہوئے کہا "یونہی اسٹیشن تک جا رہا ہوں، ٹانگیں سیدھی کرنے۔"

ڈنٹھلوں کی ننھی سی گٹھڑی کو ماتھے پر رکھ کر بولی "اکیلے میں جی گھبراتا ہوگا، بانو بی نے اچھا نہیں کیا—— خیر!" اور وہ صاف سیدھی گلی میں دائیں بائیں مٹکتی ٹھوکریں کھاتی چل دی۔

میں اسٹیشن پر پہنچا۔ دور دھواں اڑتا دکھائی دیا۔ میرے دماغ میں قسم قسم کی سوچیں گتھم گتھا ہو گئیں۔ گاڑی آئی تو ہلکا ہلکا بخار تیز ہو کر کنپٹیوں میں طبلہ سا بجانے لگا۔ بڑی لذت ناک انگڑائیاں آئیں، نظروں کی اڑان شروع ہوئی اور جب گاڑی چل دی، تو میرا دل نڈھال پرندے کی طرح دھپ سے بیٹھ گیا۔ گاڑی سے صرف ایک بوڑھا اترا جس نے بابو کے پاس پگڑی کھولی اور کسی کونے سے تہ بہ تہ لپٹا ہوا ٹکٹ نکال کر دکھایا۔ پگڑی لپیٹ کر پوٹلیاں گھسیٹتا ایک طرف چلا، پلٹ کر میری طرف دیکھا، اور پھر میرے قریب آ کر بولا۔

"یہ شام کوٹ ہی ہے نا؟——"

میں نے کہا "بابو سے پوچھو۔"

وہ غصے میں آ کر بولا "اور کیا تم قندھار سے آ رہے ہو؟"

میں وہیں ننھی ننھی کنکریوں پر بیٹھا رہا' اور جب وہاں جی نہ لگا تو کچھ پرے چیونٹیوں کے سوراخ کے قریب آبیٹھا۔ اکیلے میں جی گھبرانے لگا تھا۔ چیونٹیوں کی آمدورفت سے طبیعت بہلی رہی۔ دوسری گاڑی سے میں بانو کے میکے چل دیا۔ اور جب ان کا دروازہ کھٹکھٹایا' اور بانو کی ماں باہر آئی تو اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ "بیٹا انور خاں! تم دق والے بڑے ہسپتال نہیں گئے؟ چلے جاتے بیٹا —— کیوں نہیں گئے؟ —— واہ —— ! بڑی بیماری والے یوں اِدھر اُدھر نہیں پھرا کرتے۔ میں یہیں کھاٹ لائے دیتی ہوں' اندر کہیں سایہ بھی تو نہیں —— پانی پیو گے؟ ——" اور وہ دہلیز سے ٹھوکر کھاتی اندر بھاگ گئی۔

ایک ٹوٹا پھوٹا کھٹولا میرے سامنے ڈال دیا گیا۔ مٹی کے میلے سے پیالے میں گڑ کا شربت پینے کو ملا۔

"شیشے کے گلاس ٹوٹ گئے ہیں۔" بڑھیا بولی۔ "نئے خریدے نہیں' جنگ کا زمانہ ہے اس لیے —— اے بانو بیٹی —— ! انور خان آیا ہے۔ بانو بڑی اداس رہتی ہے بے چاری —— پر بیٹا —— تم کیسے آئے یہاں؟"

میں نے کہا "میں بانو کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

"بانو کو ساتھ لے جاؤ گے؟"

اب بڑھیا ہاتھ کے اشارے سے دروازے پر کھڑی ہوئی بانو کو میرے قریب نہ آنے کی تلقین کر رہی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو لو بیٹا —— یہ بڑی بیماری ہے نا؟ ——"

میں نے بانو کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار میں ایک تنکے کو کھرچ رہی تھی۔

بولی۔

"میری چٹھی ملی تھی آپ کو؟"

"اور میری چٹھی ملی تھی تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی —— "ملی تو تھی مگر اماں کہتی ہیں کہ آپ —— آپ ——"

اچانک بڑھیا چلّائی۔ "بھاگ جا!"

دروازے میں بانو کا چھوٹا بھائی شیشے کے گلاس میں گڑ کا شربت ڈالے آنکلا تھا۔ "بھاگ جا —— ! تیرے بھیا تھکے ہوئے ہیں —— ہاں تو بیٹا انور خاں —— !"

میں نے کہا "تو کیا بانو میرے ساتھ نہیں جائے گی؟"

بڑھیا گھبرا سی گئی "بانو کی مرضی ہو تو لے جا اسے!"

میں نے بانو سے پوچھا۔ "تیار ہو؟"

وہ وہیں سے بولی۔ "میں کہتی ہوں' آپ ذرا —— آپ کچھ ——"

میں لاٹھی کے سہارے اٹھا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو ——" اور جب میں ہولے ہولے قدم اٹھانے لگا تو بڑھیا پکاری۔

"تمہیں بڑی بیماری ہے نا اس لیے' صرف اس لیے بیٹا' ورنہ بانو تمہارا ہی مال ہے —— پر تم جا کہاں رہے ہو؟"

بانو بھی سسکیوں کے درمیان بولی۔

"آپ یہ کیا کر رہے ہیں' کچھ دیر تو ٹھہریئے۔"

میں رینگتا چلا گیا اور جب میں نے گلی کے موڑ پر پہنچ کر پلٹ کر دیکھا تو بڑھیا کھاٹ کو مرے ہوئے چوہے کی طرح اٹھا کر دھوپ میں رکھ رہی تھی اور بانو دہلیز پر بیٹھی میری طرف یوں دیکھ رہی تھی' جیسے کوئی امیر بچہ اپنی کٹی ہوئی

پتنگ کو دیکھتا ہے۔

بخار میں جلتا' سینے کے درد سے کراہتا جب میں شام کوٹ اسٹیشن پر اترا تو مجھے گاڑی کے ایک ڈبے میں کھڑکی کے قریب ہیڈ ماسٹر بیٹھا نظر آیا۔ ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ رنگ اڑا ہوا تھا۔ ہونٹ کھلے ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے ایک ساتھی سے بولا۔

"یہی ہے وہ ــــــ یہی ہے۔"

اور گاڑی چل دی۔

گرتا پڑتا کافی دن ڈھلے میں اپنے گاؤں کے قریب پہنچا۔ پگڈنڈی کے پاس خاتون درزن ایک مینڈ پر ساگ توڑتے ہوئے ہولے ہولے کوئی ہوائی دوہہ گنگنا رہی تھی۔ میرے ذہن نے اچانک میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے سے بکھیر دیئے' میں بے تحاشا بول اٹھا۔

"اے درزن کی بچی!"

وہ سر اٹھا کر بولی۔ "ارے منشی انور خان!"

میں نے کہا "اری تو یہاں بیٹھی ساگ توڑتی رہتی ہے اور ہماری شامیں لٹی جا رہی ہیں پگلی!"

"شامیں؟" مینڈ سے اترتے ہوئے اس نے تعجب سے کہا۔

"اندھیری شامیں' سرمئی شامیں!"

اس نے مسکرا کر ایک جنگلی پھول مجھ پر پھینک دیا۔

اور جب اس شام کو دروازے کی زنجیر چھنچھنائی' تو دکھنی منڈیر کے

سب سے اونچے سوراخ میں سے ایک چڑیا پُھر سے اڑ کر کہیں غائب ہو گئی۔

ذہن کی کڑیاں کٹ کر گر گئیں۔

اور!

خلد سے نکلا ہوا آدم!

ایک نئی جنت میں اتر پڑا۔

نشیب و فراز

کائنات نے چپ سادھ لی تھی اور پچھمی پربت سے ہاتھ بھر اوپر سورج جیسے لٹک کر رہ گیا تھا۔ دوپہر کو تو میں نے سایوں کو حرکت کرتے بھی محسوس کیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ سائے رینگتے جا رہے ہیں۔ مکان کے سائے کا آخری خط اب بیری کے تنے سے مس کر رہا ہے، تو اب بیری کی پرلی طرف چڑھ رہا ہے۔ اب دیوار کی چوٹی پر ہے، تو اب دیوار پھاند کر پرلی طرف خشک بھیکڑوں کے آس پاس بکھرے ہوئے کنکروں پر کھسکا جا رہا ہے۔ لیکن جب شام قریب آئی تو بوڑھا وقت تھک ہار کر بیٹھ رہا۔ سائے جہاں تھے وہیں جم گئے، سورج لٹک گیا اور کھیت کے پرلے کنارے پر بیٹھا ہوا رکھوالا اپنے گائے ہوئے دوہوں کی غیر محسوس لہروں میں الجھ کر رہ گیا۔ آک کے پیڑ کے پاس بت کی طرح جما بیٹھا تھا۔ بنسری پاس دھری تھی اور اپنے ٹھکانوں کو جاتی ہوئی چڑیوں کے غول آزردہ سی فضا سے اتر کر باجرے کی جھکی ہوئی بالیوں سے چمٹ گئے تھے۔

بہت دیر تک نہ چڑیاں اڑیں، نہ کھیتوں کے رکھوالے نے حرکت کی۔ نہ سورج نے پچھمی پربت کی منتظر چوٹی کو چھوا۔ گاؤں کے قلب سے لپکتی ہوئی پگڈنڈی پر دو مسافر لاٹھیوں پر پوٹلیاں لٹکائے نشیب میں اتر رہے تھے اور مسجد

کے مینار پر ایک چیل پر سمیٹے کھلونے کی طرح بے حس بیٹھی تھی۔

مجھے حیرت ہونے لگی کہ آخر اتنے بڑے واقعے بلکہ حادثے پر گاؤں والوں اور گاؤں والیوں نے کسی قسم کی مسرت یا غصے کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ شیدو مجھے رات کے وقت کھلیان پر آنے کا پیغام بھیجے اور گاؤں میں کھلبلی نہ مچ جائے۔ اور پھر یہ وقت کتنا ذلیل کارندہ ہے مشیت کا کہ مہینوں کی محنت سے حاصل کئے ہوئے لمحے کو اپنے استخوانی پنجے میں دبائے بیٹھا ہے۔ نہ آگے بڑھتا ہے کہ شیدو سمٹتی سمٹاتی گنجان کھیتوں کی بے کراں وسعتوں کو زندگی کی تڑپ بخشتے میرے پہلو میں آبیٹھے! اور نہ پیچھے ہٹتا ہے کہ میں شیدو کی حشر انگیز پلکوں کی کاٹ سے بالکل بے خبر کالج کے محرابی برآمدوں میں اڑتے ہوئے لمحوں کو گھماتا اور اچھالتا پھروں!

میں نے کھلیان پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اسے ایک آوارہ چیونٹے کے قریب رکھ کر اس کی حرکات دیکھنے لگا۔ چیونٹا تنکے کو مس کر کے رک گیا۔ خشخاش کے دانے ایسے سر کو ادھر ادھر گھمایا۔ پلٹ کر بھاگا۔ تھوڑی دور جا کر رک گیا، گھوما اور واپس آکر تنکے پر چڑھ گیا۔ میں نے تنکا اوپر اٹھا لیا۔ اب چیونٹا کبھی ادھر بھاگتا ہے۔ کبھی اُدھر دوڑتا ہے۔ ایک کنارے پر جا کر رکتا ہے۔ دوسرے کنارے پر جا کر فوراً پلٹتا ہے، اور میں مسکرائے جا رہا ہوں اس کی بے بسی پر۔ کبھی چیونٹا تنکے کے کسی حصے پر رک کر نیچے دیکھتا ہے اور پھر سر کو ادھر ادھر گھما کر اپنا غیر مختتم چکر شروع کر دیتا ہے۔ میں تنکے کا وہی سرا انگلیوں میں تھام لیتا ہوں جس کا چکر لگا کر چیونٹا پلٹتا ہے۔ ایک بار میں اس کی بالوں ایسی ننھی ننھی ٹانگوں میں اتنا محو ہوا کہ انگلیاں بدلنا بھول گیا۔ چیونٹا میرے ہاتھ پر چڑھ گیا اور جھک کر مجھے اس زور سے کاٹا کہ میری چیخ نکل گئی۔ ہاتھ جھٹکا اور پھر چیونٹے کا پچھلا حصہ پکڑ کر اسے کھینچا، چیونٹا دو ہو کر رہ گیا۔ سر اسی طرح

میرے ہاتھ کی الٹی طرف پیوست تھا۔ اور دھڑ کا دوسرا پلپلا حصہ میری گھبرائی ہوئی انگلی سے چھٹ کر تنکے کے پاس گر گیا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے چیونٹے کا سر جلد سے الگ کیا۔ جہاں درد محسوس ہونے لگا تھا' وہاں چٹکی بھر خاک ڈال دی اور پھر اچانک سامنے دیکھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ رکھوالا جا چکا تھا۔ چڑیاں اڑ چکی تھیں اور گاؤں کے قلب سے لپکتی ہوئی پگڈنڈی سرمے کی پھیلی ہوئی دھاری سی معلوم ہوتی تھی۔

اور پھر اس دھاری پر بھی کاجل پھر گیا۔ ستارے اتنی بڑی تعداد میں ابھرے کہ اب سے پہلے کیا ابھرے ہوں گے۔ خاموشیاں اندھیری فضا میں سنسانے لگیں اور بہت دور کہیں گیڈر پکارے۔ آدھی رات تک میرا ذہن غیر مرئی قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ اور جب سوچ بچار کی خلاء وسوسوں سے لبریز ہو گئی اور جب سامنے گاؤں میں آخری دیا بھی بجھ گیا تو میں اٹھا۔ ٹارچ کی روشنی میں مینڈھ کو پھاندنے ہی والا تھا کہ ایک بھورا ناگ شپ سے ایک کھیت سے نکلا اور خپ سے دوسرے کھیت میں گھس گیا۔ ٹارچ پر میری انگلیوں کی گرفت اتنی مضبوط ہو گئی کہ اگر گھٹیا مال ہوتا تو پچک کر رہ جاتا۔ نہایت احتیاط سے آگے بڑھا۔ مگر اب ہر چیز پر ناگ کا گمان ہوتا تھا۔ شیدو کے تصور پر بابی کے باسیوں کے بل بہ بل کھاتے ہیولے چھا گئے۔ زندگی آنکھوں اور قدموں میں سمٹ آئی۔

مگر جب میں گاؤں کے بالکل قریب پہنچا تو خیال آیا' شاید شیدو کسی دوسرے رستے سے کھلیان پہنچ گئی ہو۔ میں بھی تو عجیب سی راہوں پر سے ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ ٹارچ کے بٹن کو پوری قوت سے دباتا جب میں اس مقام کے نزدیک پہنچا جہاں سے ناگ گزرا تھا' تو رک گیا۔ اور پھر آگے جانے کا کوئی فائدہ بھی تو نہ تھا۔ وہیں سے ٹارچ کی روشنی کھلیان پر گھمائی اور مایوس ہو کر پلٹا۔

ابھی میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ تیزی سے اٹھتے ہوئے پیروں کی دھب دھب اور چوڑیوں کے تیز اور پریشان چھناکوں نے میرے اوسان کو جکڑ لیا۔ شیدو ہانپتی ہوئی میرے قریب رک کر بولی۔

"واپس چل دیئے؟"

ماتھے سے پسینہ پونچھنے کے لیے اس نے ہاتھ اٹھایا تو چوڑیاں چھنن سے اس کی کہنی میں جا گریں۔

"یہ چوڑیاں پکڑوا دیں گی ہمیں!" میں نے کہا۔

"اچھا——!" اس نے اپنا ایک بازو ایک پتھر پر رکھا اور چوڑیوں پر گھونسا جما دیا۔

"شیدو۔" میری سرگوشی چیخ کی حدیں چھو آئی—— مگر اس نے دوسرے بازو کو ننگا کر کے ٹھن سے ہاتھ مارا۔ اور پھر ہلکی سی تالی بجا کر بولی۔

"اب—— اب بتاؤ کیسے بولیں گی چوڑیاں؟"

میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا کہ اچانک بہت سے قدموں کی چاپ نے ہم دونوں کو چکرا دیا۔ "شیدو۔ شیدو۔" کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ میں اِدھر کھسک آیا اور شیدو اُدھر سرک گئی۔ میں گنجان کھیت کے بھیگے بھیگے پودوں کو ہاتھوں کے بل چیرتا بہت دور نکل گیا۔ "شیدو شیدو" کی آوازیں آتی رہیں اور معاً تڑاخ سے کوئی بولا۔ "یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے پھلپائی!"

مجھے گمان سا ہوا کہ کسی نے شیدو کی پیٹھ پر دھول جمائی ہے کیونکہ دھرتی کا کلیجہ دھم سے بیٹھتا محسوس ہوا۔ میرا خون کھول اٹھا۔ مگر کھولاؤ مستقل نہیں ہوتا اور زندگی کسے عزیز نہیں۔

جب چار طرف خاموشی چھا گئی اور ننھے ننھے کیڑے پودوں سے رینگ کر میرے جسم سے چمٹ گئے تو مجھے اچانک اپنی کمزوری اور بزدلی کا احساس

ہوا۔ کھیت سے نکل کر مینڈ پر آیا تو دور جھیل کی اس طرف مدقوق چاند ہانپ رہا
تھا اور قریب ہی درخت پر کوئی پرندہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ زرد بیمار چاندنی سے
اندھیرا اڑتی ہوئی شکل اختیار کر رہا تھا۔

گھر آکر بستر پر گرا تو محبت کی یخ بستگی اور موسم کی خنکی نے رگوں میں
کپکپی سی دوڑا دی۔ کچھ سویا۔ کچھ جاگا—— مگر جب گھر والے جاگے تو میں سو
رہا تھا۔

امی نے ہولے سے شانہ ہلا کر کہا۔

"باہر تیرا دوست بیٹھا ہے' کب سے راہ دیکھ رہا ہے تیری۔ آخر ایسی
نیند بھی کیا؟"

میں غنودہ آواز میں بولا۔

"کیا سورج نکل آیا؟" اور پھر آنکھیں کھولتے ہی مشرق کی چکاچوند
نے رگوں میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے انگڑائی کے دوران ہی پوچھا۔ "
کب نکلا سورج؟"

امی ہنس کر بولیں۔ "صبح کو۔"

میں نے بھی ہنسنا چاہا مگر گلے میں جیسے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی کرچیاں
اٹک گئی ہوں۔ سلیپر گھسیٹتا باہر آیا۔ اکبر ایک نکیلے کنکر سے خاک پر مثلثیں سی
بنا رہا تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔

"کچھ سنا؟"

صبح کی شریر چڑیاں پڑوس کی بیری پر چلّانے لگیں اور آٹا پیسنے والی
مشین بکی "کیا—— کیا—— کیا!"

"کیا؟——" میں نے سوچا۔

اکبر نے مثلثوں کو پاؤں سے مٹاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم نے کچھ نہیں سنا؟ وہ تمہاری شیدو بکی جا رہی ہے نا!"

"کیسے؟" میرے ذہن کی پگڈنڈیوں پر شپاشپ ناگوں کی آمدورفت
جاری ہو گئی اور میرے جسم پر کیڑے سے رینگنے لگے۔ میں نے اکبر کی کلائی کو
اتنی شدت سے دبایا کہ وہ بل کھا کر دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ بولا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ شیدو کا باپ چودھری کا مقروض ہے۔ پانسو
دینے ہیں شاید۔ وہ مدت سے شیدو کا سودا کرنے کی دُھن میں تھا۔ اتفاق سے
کل لڑکیوں کے سوداگر آ نکلے تھے۔ وہ چار سو دیتے ہیں' یہ پانسو مانگتا ہے' اور
ادھر چودھری کہہ رہا ہے کہ اگر آج ہی پورے پانسو کے پانسو نہ ملے تو زین
خان حوالات کی سلاخوں سے لپٹ لپٹ کر پڑا روئے گا۔"

میں سوچنے لگا' بالکل ان ہونی باتیں' جیسے کوئی قیدی جیل کے داروغہ
پر جھپٹنے اور چپا کر نکل جانے کے منصوبے باندھ رہا ہو' اور پھر اپنے سامنے
مضبوط سلاخوں کے ناگ دیکھ کر اندھیری کوٹھڑی کے متعفن کونے میں سمٹ کر
رہ جاتا ہو۔ میں نے شیدو کے دشمنوں کو چبانے اور نگلنے کی راہیں تراشنا چاہیں۔
مگر میرے سامنے خاندانی وجاہت کی دیواریں حائل تھیں۔ اکبر سے کوئی مشورہ
کئے بغیر میں اپنے گھر آگیا۔ والد اپنی سفید ڈاڑھی میں انگلیاں ڈالے نماز کے بعد
کے طویل وظائف گنگنا رہے تھے۔ اور امی دہی بلونے کے بعد مکھن اکٹھا کر رہی
تھیں۔

میں سیدھا اندر جا کر دھم سے ایک پلنگ پر گر گیا۔ موٹے موٹے مچھر
کونے میں سرسرائے اور مخنی چکر کاٹتے دیوار سے چمٹ گئے۔ ایک چیونٹا پلنگ
پر کسی غیر کا قبضہ محسوس کر کے نہایت تیزی سے بے ڈھنگے دائرے بنانے لگا
—— بالکل اینڈے بینڈے دائرے—— زندگی کے ان حقائق کے سے
دائرے' جن تک پہنچنے کے لیے اگر مذہب سیدھی راہ سجھاتا ہے' تو فلسفہ روڑا

اٹکاتا ہے۔ اور پھر ندی نالے اگر خط مستقیم میں بہیں تو قدرت کا حسن لٹ
جائے۔ جمال کا کبریائی نظریہ سیدھے خطوط کا روادار نہیں۔ وہ قوس قزح ایسی
نازک چیز میں بھی ایک خم ڈال کر ہی مطمئن ہوتا ہے۔

کڑوی کسیلی حقیقتوں کے وہ کانٹے جو جوانی کے پھولوں تلے دبے رہتے
ہیں' میرے خیالوں میں چبھنے لگے۔ کئی محاذ قائم ہوئے اور ٹوٹ گئے۔ کئی
مورچے بنے اور چھٹ گئے۔ اور آخر میرے قدم وحشیانہ اور مجذوبانہ تیزی
سے بڑھے۔ میں نے اپنے آپ کو بزرگ والد کے سامنے پایا۔

"ابا جان!" میں نے اپنے آپ کو کہتے سنا۔ "ابا جان! اگر مجھے اس
وقت ـــــ بالکل اسی وقت پانسو روپے کی ضرورت پڑ جائے' اور ضرورت
بھی ایسی ہو جس کا پورا ہونا اور میرا زندہ رہنا ہم معنی ہوں تو آپ کیا کریں
گے؟"

ابا جان تمام وظائف کے رس کو ایک لمبی چھو سے اپنے سینے پر چھڑک
کر بولے۔

"عجیب باتیں کرتے ہو۔ اگر کوئی ایسی ہی بات ہے تو پانسو کیا پانچ ہزار
لگادوں۔ تم ہی تو میرا سب کچھ ہو۔"

راستہ صاف تھا۔ میں نے پانسو طلب کئے تو مسکرا کر بولے۔

"لیکن آخر بات کیا ہے؟"

آسمان پر کوئی بدلی نہ تھی۔ مگر مجھے ایک زہرہ گداز کڑک سنائی دی۔
سنبھل کر میں نے لاڈلے بیٹے کے حربے استعمال کرنا شروع کئے۔

"جی پھر بتاؤں گا' آپ پانسو دے دیں۔ کام ہو جائے' پھر سب کچھ بتا
دوں گا۔"

وہ بدستور مسکراتے رہے۔ وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔ وہ غصے میں

بھی ہوتے تو مسکراتے۔ مجھے تو ان کی اس قوت یا کمزوری کا مدتوں سے تجربہ
تھا۔

روپے لے کر میں باہر لپکا۔ اور چوپال پر جا نکلا۔ چودھری حقے کی نے
پر باریک تار اور ریشم لپیٹنے والے کو گھرک رہا تھا۔ "ابے تان کر لپیٹ اپنی ماں
تار کو۔ ڈھیلا رہ گیا تو ایک ہی دن میں کئے کرائے پر تیری ماں پانی پھر جائے گا۔
ریشم کو دانت سے مت کاٹ' تیری ماں قینچی منگائے دیتا ہوں ـــــ اور وہ
زینو بھی تو اب تک نہ آیا کمبخت۔ قسم ہے' اگر آج وہ تیری ماں پانسو نہ لایا تو
دھر رگڑوں گا اسے۔ مجسٹریٹ تیری ماں اپنا آدمی ہے۔ میرے بیٹے سے سکول
کے دنوں کا یارانہ ہے' مجھے چچا جان کہتا ہے۔"

"چچا جان!" میں نے چودھری کے قریب جا کر کہا "ایک بات سنئے گا'
ذرا ایک طرف ہو کر۔"

چودھری میرے ساتھ نہایت تپاک سے مصافحہ کر کے اٹھا' جوتے گھسیٹتا
مجھے ایک کونے میں لے گیا اور بولا۔

"تیری........." اپنے تکیہ کلام کو وہ جا اور بے جا مقامات پر استعمال
کرنے کی تمیز رکھتا تھا۔ اس لیے رک گیا اور پھر میرے شانے کو تھپک کر بولا۔

"کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے جی!" میں نے کانوں کی گونج اور حلق کے زخموں سے
بے پروا ہو کر کہنا چاہا۔ "وہ زین خان آپ کا مقروض ہے نا؟"

"ہاں ہاں!" وہ مجھے ایک چوڑے سے پتھر پر بٹھا کر بولا۔ "مدتوں کا
مقروض ہے' اور پھر آج تو اس کی لاڈلی کے خریدار بھی آنکلے ہیں کہیں سے۔
بیچ ڈالے اسے' بیچنے کا مال ہے' سنبھالے رکھنے سے گھن لگ جائے گا اسے
ـــــ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میرے کان شوکنے لگے اور گلا رندھ گیا۔ میں نے کہا۔

"وہ پانسو میں دے دوں گا آپ کو!"

"تم؟"

"جی ہاں!"

"کب؟"

"اب!"

"یعنی ابھی؟"

"جی ابھی!"

"کیوں تم نے خرید لیا شیدو؟ بڑا غضب کیا۔ لٹیا ہی ڈبو دی۔ لو بھئی اور سنو۔" چودھری اٹھ کر اپنے حواریوں کے قریب گیا۔ "اس میں پردے کی کون سی بات ہے۔ صاحبزادے نے زینو سے تیری ماں شیدو کا سودا چکا لیا ہے۔ اب شیدو تیری ماں دلہن بن کر آئے گی بھائی مولوی اسمٰعیل کی حویلی میں۔ چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل اسی کو کہتے ہیں۔"

لوگ مجھے گھورنے لگے، جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ کتنوں نے مجھ سے چچ چچ چچ سے ہمدردی جتائی۔ ایک نے کہا۔ "تو پھر چودھری! قرض بھی اتار لے گا بھڑوا؟"

چودھری پلنگ پر بیٹھ کر بولا۔ "دیکھوں!"

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "وہ پانسو میں ادا کرتا ہوں۔"

چودھری ہنسنے لگا۔

"لو بھئی! پانسو تو میاں صاحبزادے ہی اٹھائے پھر رہے ہیں۔ پر میں یوں اکیلے بیٹھ کر رسید نہیں لکھوں گا۔ زینو کے سامنے ہوگا سارا معاملہ۔ میں تیری ماں کھری بات کہتا ہوں۔ کوئی برا مانے تو جائے بھاڑ میں—— ہاں تو

بھئی، ذرا تیری ماں زینو کو پکار لانا۔"

ایک شخص زین خان کو بلانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چودھری پکارا۔

"رہنے دو بھئی رہنے دو۔ خود آرہا ہے۔ پہلے سے میاں صاحبزادے نے کہلوا بھیجا ہوگا۔"

زین خان کے چوپال پر آنے سے قبل ہی میں نے چودھری کو بتا دیا کہ میں محض زین خان کی غریبی سے متاثر ہو کر اس کا قرضہ ادا کرنے آیا ہوں، ورنہ مجھے شیدو سے مطلب ہے نہ اور کسی قسم کا لالچ ہے۔ چودھری نے میری بات سن کر مونچھوں کو نچلے ہونٹ سے ڈھانپ لیا، اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی میاں صاحبزادے۔ دودھ میں مینگنی سب کو نظر آجاتی ہے۔ لاکھ کوشش کرو چھپانے کی، مینگنی اوپر ہی ابھر آئے گی۔"

میں چودھری کے اس صحیح اندازے سے اندر ہی اندر کئی بل کھا گیا۔

اتنے میں زین خاں آنکلا۔ اور پھر اس روز غریب بڈھے سے اتنی افواہیں وابستہ تھیں کہ چوپال پر اس کے قدم دھرتے ہی گاؤں کا گاؤں جمع ہو گیا۔

"ہاں تو کوئی انتظام کیا کہ تیری ماں چوکیدار کو تھانے بھیجا جائے۔"

چودھری حقے کی نے پر نئے نئے لپٹے ہوئے تار پر انگلی پھیر کر بولا۔

گھبرایا ہوا زین خان ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھا اور چودھری کے سامنے جھک کر آہستہ سے بولا۔

"پردے کی بات ہے مالک۔"

چودھری ہنسا۔ چودھری کی ہنسی گاؤں والوں کے طویل قہقہوں کی بسم اللہ تھی۔ دیر تک پتھر سے برستے رہے، اور سہما ہوا زین خان پیچھے ہٹ کر میرے قریب آگیا۔

"یہ لو پانسو!" میں نے سرگوشی کی اور سب کی نظریں بچا کو نوٹوں کا

بلندہ زین خان کے ٹھنڈے ہاتھ میں گھسیڑنا چاہا۔ "تھام لو انہیں اور پھینک دو، چودھری کے منہ پر ——— کمینہ ——— بدذات۔"

لیکن زین خان کا ذہن ابھی میری اس عجیب و غریب قربانی کو گرفت میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری بولا۔

"میاں زین خان۔ آج تو موقعہ بھی اچھا ہے۔ سنا ہے چند سوداگر بھی اترے ہوئے ہیں تمہارے ہاں، اور پھر یہ بھائی مولوی اسمٰعیل کے صاحبزادے بھی تیری ماں حاتم کی قبر پر لات جمانے آئے ہیں!"

کسانوں کی حیران نظریں مجھ پر تیروں کی طرح برس پڑیں۔ لپک کر میں نے پانسو کے نوٹ چودھری کی جھولی میں پھینک دیئے اور کہا۔

"گن لیجئے انہیں اور حساب کتاب کر لیجئے زین خان سے۔ اب میرا اور زین خاں کا معاملہ رہا۔ آپ کا ادھار ختم۔"

مجمع دم بخود رہ گیا۔

چودھری ہنسا۔ مگر اب کے یہ ہنسی کسانوں کی سرگوشیوں کی بسم اللہ تھی۔ ایسی دبی دبی گونج اٹھی جیسے دور کہیں گنجان جھنڈوں سے تیز ہوائیں گزر رہی ہوں۔

زین خان نے میری طرف دیکھا۔ کتنی گہرائیاں تھیں ان مکی کے دانوں ایسی جہاندیدہ آنکھوں میں۔ کتنی محبت اور مسرت!

میں چپ چاپ کھڑا اپنا ایک ناخن کریدتا رہا۔

ادھر جب گلی کے موڑ پر مجھے اپنے والد بزرگوار آتے نظر آئے تو آسمان میں شگاف ہوتے دکھائی دیئے اور زمین کا کلیجہ دھڑ دھڑ بجتا محسوس ہوا۔ دماغ کی بے ہنگم چیخوں نے مجھے دیوار کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب شیدو کی بجائے لمبے لمبے ناگ تھے اور گلے میں ان گائے گیتوں کی جگہ بلوری چوڑیوں کی کرچیاں۔

جب ابا جان نے چوپال پر قدم رکھا تو سرگوشیاں رک گئیں اور چودھری کی جھولی میں پڑے ہوئے نوٹ اس کی ران کے نیچے کھسک گئے۔ بہت دور پورب کے اونچے پربت کے عقب سے گھنگھور گھٹا نے سر اٹھایا اور گرج کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔

وہ سیدھے میرے پاس آئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"تم نے بہت برا کیا بیٹا، بہت برا کیا تم نے۔ میں شاید زین خان کو اس مصیبت میں خود ہی مدد دے دیتا۔ لیکن تمہاری یہ سوداگری مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔" آج ان کے لبوں پر بہت تلاش کے باوجود مجھے مسکراہٹ نظر نہ آئی۔

"کیسی سوداگری ابا جان؟" میں نے پوچھا۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔ "آپ کو غلط خبر ملی ہے، مجھے صرف زین خاں کی غریبی اور بے کسی نے مجبور کیا ——— لوگوں کا شک بالکل بے بنیاد ہے۔"

انہیں یہ یقین دلانے میں کافی جرأت سے کام لینا پڑا کہ میں شیدو کے معاملے میں بالکل بے قصور ہوں۔ چند لوگوں نے بھی میری ہم نوائی کی۔ چودھری نے بھی پانسو روپوں کی حدت سے مجبور ہو کر ایک کلمہ کہہ دیا۔

"نہیں جی، صاحبزادہ تو اللہ رکھے بالکل فرشتہ ہے۔"

اور جب ابا جان بے دلی سے مسکرائے تو گھٹا سے کٹ کر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے بادلوں نے ننھی ننھی بوندیاں برسانا شروع کر دیں۔ ابا جان یہ کہتے ہوئے چل دیئے۔ "یہ بات ہے تو خیر کوئی حرج نہیں۔ زین خان میرا بھائی ہے!"

مجمع منتشر ہونے لگا۔ چند لوگ چھپر تلے کھسک آئے۔ سہج سنگھ کو بلا کر رسید لکھی گئی اور جب زین خان رسید کو چادر کے ایک پلو میں اڑس کر جانے لگا تو میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

"چچا! وہ سوداگر کون ہیں کم بخت! تم نے انہیں اپنے گھر میں کیوں بٹھا رکھا ہے؟ کچھ جانتے بھی ہو لوگ کیسی کیسی بے پر کی اڑا رہے ہیں؟ کہتے ہیں کہ وہ شیدو کو خریدنے آئے ہیں۔"

زین خان کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر آنسوؤں کی جھلی چڑھ گئی۔ بولا۔

"ٹھیک کہتے ہیں بیٹا——— لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر تم نے آج مجھے نہ خرید لیا ہوتا تو سچ کہتا ہوں شیدو ہی اونے پونے خرید لی گئی ہوتی۔ بھلا ہو تیرا' میں ابھی جا کر ان مردودوں کو چلتا کرتا ہوں۔ کل سے حرامزادے حلوے مانڈے اڑا رہے ہیں۔"

وہ اپنے گھر کو چل دیا۔ میں نے اپنی حویلی کی راہ لی۔ زبردست کامیابی کے ساتھ ساتھ ابا اور امی کی کچھ سوچتی اور پوچھتی ہوئی نگاہوں کے خوف نے مجھے نہایت ہولے ہولے چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بھیگی ہوئی فضا میں امید کی کتنی محل سرائیں تعمیر کیں۔ کتنے انوکھے خواب دیکھے' کتنے راہ چلتوں کو سلام کا جواب جان بوجھ کر نہ دیا۔ میں اپنے آپ پر مکمل اور بے داغ غنودگی طاری کرنا چاہتا تھا۔ غنودگی کے اس فردوسی خطے کو میں چھونے ہی والا تھا کہ ناگاہ گاؤں کے وسط سے ایک شور اٹھا——— بالکل الجھا ہوا اور بے ہنگم شور لیکن آوازوں کی نوعیت کسی خوفناک خطرے کی ترجمان تھی۔ میں پلٹ کر لپکا۔ مسجد کے قریب مجھے اکبر ملا۔ میرے سوال کا انتظار کئے بغیر وہ بولا۔

"سوداگر شیدو کو اڑا لے گئے۔"

"کیا؟" یہ لفظ میرے منہ سے چیخ بن کر نکلا۔

"شیدو اغوا ہو گئی!"

"کیسے؟"

"بس زین خان جب چوپال سے گھر کو پلٹا تو شیدو غائب تھی۔ سارا

گاؤں چوپال پر جمع تھا۔ صرف چند پڑوسنوں نے اسے ایک گھڑسوار کے آگے تڑپتے پھڑکتے دیکھا۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا اور ان کے پیچھے ایک اور سوار تھا۔ وہ ہوا کی طرح اڑے جا رہے تھے۔"

چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی لیکن میرے حواس کا واویلا اس چیخم دھاڑ سے کہیں آگے نکل گیا۔ اکبر کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے گھر کی طرف لپکا۔ اصطبل سے گھوڑی کھولی۔ اس موقعہ پر صرف لگام کا تکلف ہی مناسب سمجھا۔ حویلی سے نکل رہا تھا کہ عقب سے ابا جان کی آواز آئی۔

"سعید بیٹا——— کہاں چلے؟"

"سعید! میرے لال!" میری امی کی نحیف آواز آئی۔

بادل گاؤں پر جھک آئے تھے۔ ہواؤں میں جلا دینے والی خنکی تیر رہی تھی اور کونجوں کی کرلاتی ہوئی ڈاریں سرمئی پس منظر پر غیر محسوس لکیروں کا تانا بانا تیار کر رہی تھیں۔ بہت نیچے بڑے راستے پر چند سوار اڑے جا رہے تھے اور زین خان کے گھر سے اٹھتا ہوا شور دبی ہوئی گونج بن کر رہ گیا تھا۔

بہت دور تک مجھے ابا جان کی صدائیں سنائی دیتی رہیں۔ مگر گھوڑی برق رفتار تھی اور میں بے قرار تھا۔ پہاڑی راہ سے اتر کر جب میں میدان میں آیا اور ایڑ لگائی تو چند لمحوں میں شیدو کے عزیزوں کے قریب سے گزرتا اتنی دور نکل گیا کہ یہ لوگ کل دار کھلونے سے بن کر رہ گئے۔

ہوا میرے کانوں کے قریب ایک مسلسل اور پر سوز ساز بجاتی لپکی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا تھا' جیسے رکابیں زمین کو چھو گئی ہیں۔ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑ رہی تھیں اور بادل کی گونج گھوڑی کی تیز ٹاپوں میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔

جب میں قصبے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ دو سوار کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر

نہایت تیزی سے دکھنی رستے پر اڑتے دیکھے گئے۔

دو گھنٹے پیشتر ——— ! میں نے گھوڑی کی طرف دیکھا جس کے نتھنے پھڑک رہے تھے' اور جسم پسینے میں شرابور تھا۔ گھوڑی کو بڑے راستے سے ہٹا کر ایک غیر آباد قطعے کی طرف چل دیا۔ کھیتوں کو پار کر کے اسے ایک بیروٹے سے باندھا اور خود قریب ہی ایک چشمے کے کنارے جا بیٹھا۔

پانی گول اور سپید سنگریزوں پر بڑبڑاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ ایک کمزور سی بدلی کی آڑ سے سورج کی کرنیں نکل کر پانی میں ناچ رہی تھیں اور جنگلی بیلوں کا جال آس پاس پھیلتا ایک پھلاہی پر چڑھ کر نیچے لٹک گیا تھا۔ پرلی طرف چڑیوں کے چند جوڑے نہا رہے تھے اور ایک شرمیلا ممولا ایک چٹان پر بیٹھا افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اڑا' اور آن کی آن میں کھیتوں پر سے ہوتا قصبے پر سے گزرتا گھٹا میں گھل گیا۔

پھلاہی کے نیچے مجھے مکمل سکوت کی دیوی ملی۔ زندگی اور اس کی ساری دھڑکنیں میرے دماغ کے مرکز میں جمع ہو کر ناچنے لگیں۔ میں نے سوشلزم اور فاشزم کے نظام پرکھے۔ میں نے پرانے رواجوں اور فرسودہ رسموں پر خیال آرائیاں کیں۔ زین خان اور چودھری کے سماجی تفرقے کا موازنہ کیا۔ سوداگروں اور محبت کرنے والوں کی دست درازیوں پر غور کیا' اور جب بے بس اور بے کس شیدو زخمی کبوتری کی طرح برق رفتار گھوڑے پر تڑپتی پھڑکتی دکھائی دی تو میں نے اپنی گھوڑی کی طرف دیکھا جس کا رنگ پسینے کی وجہ سے بدل گیا تھا۔

ان پہاڑیوں کے اُس طرف کھلے میدان ہیں۔ اور ان میدانوں میں ان گنت راہیں ہیں۔ جگہ جگہ پر ننھے ننھے دیہات ہیں اور پھر لاریاں ہیں' اسٹیشن ہیں ——— گاڑیاں ہیں۔ وہ گاڑیاں جن کی منزلیں دور دراز ہیں اور جن

کو ان جذبات کا احساس تک نہیں جو ان میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے دلوں میں تڑپ اور بھڑک رہے ہیں۔

خیالی دنیا میں بھٹک بھٹک کر میرا ذہن قانون کی طرف پلٹا۔ وہ قانون جو مرمریں محلوں سے نکلتا ہے اور کھپریل کے چھپروں میں بسیرا ڈھونڈھتا ہے۔ اور جب میں نے سوچا کہ ذرا سی تاخیر بھی بہت بڑے اور برے نتائج کی ضامن ہو سکتی ہے تو میں جھلّا کر اٹھا اور گھوڑی پر سوار ہو کر تھانے کو چل دیا۔ مگر دور تھانے کی کالی بھجنگ عمارت کے غار ایسے بھیانک دروازے کے پاس مجھے زین خان اور اس کے عزیز تھانیدار کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑے نظر آئے۔

ناکام و نامراد میں اپنے گاؤں کو چل دیا۔ مجھے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں اور سرگوشیاں کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

"شیدو اور سعید کا عشق بھی ہیر رانجھے کے عشق کی طرح زندہ رہے گا اور کئی دوہے باز ان کے قصے لکھیں گے ——— مولوی اسمٰعیل کی ناک کٹ کر کوڑے کے ڈھیر میں گر گئی ——— ہے ہے بے چارا مولوی اسمٰعیل۔"

میں اصطبل میں پہنچا تو اوپر سے ابا جان آگئے۔ میں نے ان کے لبوں پر مسکراہٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ان پر مسکراہٹ کی بجائے کپکپاہٹ تھی۔ وہ بولے۔

"تم نے بہت برا کیا بیٹا! بہت برا کیا تم نے!"

میں نے سر جھکا لیا۔ چپ چاپ گھر آیا اور پلنگ پر گر پڑا۔ ایک چیونٹا غضب ناک ہو کر چادر پر بے ڈھنگے چکر کاٹنے لگا اور پھر چند لمحوں کے بعد اپنی خاص رفتار اختیار کر کے اپنے ایک مردہ ساتھی کا جسم اٹھایا اور پلنگ پر سے اتر کر ایک سوراخ میں گھس گیا۔

امی دروازے سے پیٹھ لگا کر رو رہی تھیں اور باہر ابا جان کہہ رہے
تھے۔

"میں نے پہلے بھی تجھے کئی بار کہا ہے بی بی کہ ہمارا لڑکا بڑا جلد باز
ہے۔ ہوا میں گرہ لگاتا ہے۔ اب اس کی یہ حرکت دیکھی' لعنت کا اشتہار لگا دیا
میرے ماتھے پر۔ برسوں کی خدمت اور محنت سے جو نام پیدا کیا تھا اس پر کیچڑ کے
دھبے اچھال دیئے ـــــ گاؤں بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔"

مگر امی تو روئے جاتی تھیں اور خود میں رونے کی حدوں کے بالکل
قریب پہنچ چکا تھا۔ دیر تک میں ذہن کی دھندلی خلاؤں میں پلٹے کھاتا رہا۔ ایک
بار پریشان ہو کر گھر سے نکلا تو لوگوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"لے گئے شیدو کو؟"

"تم نے نہیں دیکھا! انہیں؟"

"کہتے ہیں لاہور میں منڈی ہے عورتوں کی' بیچ ڈالیں گے شیدو کو۔"

"اپنی مرضی سے تو نہیں گئی؟"

تنگ آ کر گھر لوٹ آیا۔ تو امی نے دلاسہ دینا شروع کیا۔ ابا جان کے
لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہونے لگی۔ لیکن یہ دلاسے اور یہ تبسم میرے سکون کا
لٹا پٹا سرمایہ واپس نہ لا سکے۔

گھر کے دلاسوں اور باہر کے طعنوں سے تنگ آ کر میں نے ایمرجنسی
کمیشن کے لیے خفیہ خفیہ کوششیں شروع کر دیں اور جس روز مجھے بنگلور میں
تربیت حاصل کرنے کے لیے فوری روانگی کا حکم ملا تو میں نے اس ضمن میں اپنی
ساری کارروائیاں ابا جان کو بتا دیں۔ وہ دیر تک بیٹھے سوچتے رہے اور پھر اٹھ
کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اپنے طویل وظائف کا رس چھو سے میرے سینے پر
چھڑک کر فرمایا۔

"فی امان اللہ ـــــ" اور پھر فرش پر بیٹھ کر وظائف میں مصروف
ہو گئے۔

امی رونے لگیں۔ ان کی جھریوں میں پھیلے ہوئے آنسوؤں اور مہربان
آنکھوں میں ٹمٹماتی ہوئی التجاؤں نے مجھے کچھ دیر تک مذبذب رکھا۔ مگر ابا جان
نے کہا۔

"خدا تمہیں کامیابی سے واپس لائے۔" تو امی جان نے بھی آنسو
پونچھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی' لیکن یہ کوشش صرف بجھتی ہوئی
چنگاریوں کی سی تھرتھری بن کر رہ گئی۔

نو مہینے میں نے بنگلور میں کاٹے اور پھر چند روز گاؤں میں گزار کر میں
مصر کو روانہ ہو گیا۔ چار سال تک غیر مانوس ملکوں میں آگ اور لہو سے کھیلتا
پھرا۔ پھولی ہوئی لاشیں دیکھیں' جن کے پیٹوں کو چھوتے ہی ان کے منہ اور
ناک سے تعفن بھرا لعاب بہہ نکلتا تھا۔ خار دار تاروں پر جسم انسانی کے چیتھڑے
دیکھے۔ لٹے ہوئے دیہات میں پریشان حال عورتیں دیکھیں جن کے ناکافی لباسوں
سے چھن چھن کر آوارہ اور بے گھر جوانی سر پیٹ رہی تھی۔ میں نے فضاؤں
میں عزرائیل کو بموں کی صورت میں لپکتے دیکھا۔ کیچڑ بھرے مورچوں میں باسی
روٹیاں نگلیں۔ حکومتوں کے بنجر غیر مطمئن رعایا کی آہوں کے زور سے فضا میں
اچھل کر ہڈی ہڈی ہو گئے۔ اور جب اتحادی فوجوں نے سسلی پر چڑھائی کی تو
میں تین مہینوں کی رخصت پر گھر آ گیا۔ بمبئی کی بندرگاہ پر اترا تو اگرچہ آسمان و
زمین وہی تھے لیکن میرا زاویۂ نگاہ وسیع ہو چکا تھا۔ ہر صورت جانی پہچانی نظر
آنے لگی۔

لیکن اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن پر جمی ہوئی خون کی
تہوں میں جھرجھری سی پیدا ہوئی ہے۔ کچھ گھبرایا۔ مگر یہ ہنگامی گھبراہٹ تھی۔

میرے کاندھوں پر چمکتے ہوئے کراؤن مجھے ان فروعی معاملات کی طرف پلٹنے ہی نہ دیتے تھے۔

جب میں لالہ موسیٰ کے اسٹیشن پر پہنچا تو مجھے گاڑی بدلنا تھی۔ میں نے سامان کو ویٹنگ روم میں رکھوایا اور پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد تھک کر میں نے پل کے نیچے سیڑھیوں کے سائے میں پناہ لینا چاہی۔

اچانک میری نظروں نے میرے خیالوں کو نہایت بھدی پٹخنی دی۔ میرے سامنے شیدو بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ایک بچہ کھیل رہا تھا' اور ایک ننھے کو وہ دودھ پلا رہی تھی۔ ایک بدحواس چیونٹا اس کے دوپٹے پر دوڑ رہا تھا۔

عورت اور دوشیزہ کے تصورات آپس میں ٹکرائے۔ میں نے ماضی کے سمندر میں الٹی زقند بھری۔ حواس ڈولنے لگے اور کاندھوں پر چمکتے ہوئے کراؤن سیپ کے بٹنوں میں بدل گئے۔

میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "شیدو۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ موٹی' مگر بے رونق آنکھیں —— پتلے' مگر پپڑیاں بھرے ہونٹ —— گول' مگر لکیروں بھرا چہرہ —— اس کی پتلیوں میں ایک آسیبی چمک پیدا ہوئی۔ مجھے نہایت غور سے دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی۔

"نوکر ہو گئے ہو؟"

میں نے کہاں "ہاں۔"

"کب سے؟"

"جب سے تم نوکری پر گئیں!"

وہ شرما گئی' کھیلتے ہوئے بچے کے سامنے ایک بھدا سا کھلونا لڑھکا کر بولی۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"سمندر پار!"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر۔"

"اچھے ہو؟"

"ہاں!"

"خوش رہو!"

میری خوفناک آنکھوں' بے رنگ چہرے' بے رس اور مختصر جوابوں سے گھبرا کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے تک نظریں دوڑا کر بولی۔

"بیٹھو——!" اور ایک گٹھری سے مٹھی بھر کر کہنے لگی —— "بیر کھاؤ گے؟"

میں نے بیر لے لیے' حواس ٹھکانے پر آ رہے تھے' مگر پتلون کی تلوار کی دھار ایسی کریز بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ اچانک ایک مچھیلا دہقان میرے قریب آ کر بولا۔

"کیا ہو رہا ہے کرنیل صاحب؟"

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں ——" میں نے جاتے ہوئے کہا۔ "یونہی رک گیا تھا سائے تلے۔"

اور مجھے عقب سے قہقہوں میں لپٹی ہوئی اس کی آواز سنائی دی۔

"ایسے چیونٹوں کو بھی سرکار بھرتی کر لیتی ہے۔ شیدو! دیکھ تو چلتا کیسے ہے —— جیسے چھالے پڑے ہوئے ہیں پاؤں میں ——!"

پھنکارتے اور دھاڑتے ہوئے انجن نے مجھے اپنی طرف بلایا۔ مگر

میرے کاندھوں سے چمٹے ہوئے کراؤن چمک کر پکارے۔ "تم کرنیل بنو گے ـــــ تم کرنیل بنو گے!"

ایک نوجوان بھکارن کی جھولی میں بیروں کو ٹھونس کر میں ویٹنگ روم کی طرف لپکا۔ اور ایک کرسی میں گر کر بیرے کو آواز دی۔ "میں ابلتی ہوئی چائے کے آٹھ دس پیالے پیوں گا۔"

اور پھر اسٹیشنوں پر سنکھیا تو بکتی ہی نہیں۔

✳

خربوزے

وہ تھکا ماندہ روتا بسورتا سو گیا۔ سوتے میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان کے ستارے ہولے ہولے خربوزوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ اور یہ آسمانی خربوزے جھم جھم کرتے اس کی جھولی میں آ گرتے ہیں' خود کٹ جاتے ہیں' بیج خود ہی الگ ہو جاتے ہیں' خود اس کے منہ میں اپنا گودا تراش کر ڈال دیتے ہیں اور چھلکے اچھل کر خود ہی پرے جا گرتے ہیں۔ اور اس کی ماں جس نے شام سے اس وقت تک چیخنے چلانے کے باوجود اسے ایک خربوزے کے لیے دو پیسے نہیں دیئے تھے' کواڑ کا سہارا لیے بیٹھی مسکرا رہی ہے اور اس کے ہم جولی پست دیوار پر سے اپنے گرد آلود سر اٹھا کر اسے تعجب اور رشک سے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک ایک خربوزہ اس کے سر پر آن گرا۔ اور وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا۔

"ہائے ماں' خربوزہ۔"

اور اس کی ماں اچانک نیند سے چونک کر پکاری۔

"تیرے دشمنوں کو موت آئے' تو کیا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ یہ اللہ مارے خربوزے کیا آئے میرے لیے آفت آ گئی۔ چند روز ہوئے تجھے ایک گول گول پیلا پیلا خربوزہ نہیں خرید دیا تھا ـــــ سو جا!"

اس نے اندھیرے میں ادھر ادھر آنکھیں جھپکا کر آسمانی خربوزے دیکھنا چاہے مگر بوڑھی بکری کے مدھم دھبے اور کبڑے نیم کے چپ چاپ سائے

کے سوا اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر اسے خربوزے کا گمان ہو سکتا۔

ساری رات اسے خربوزے بھرے خواب نظر آتے رہے اور جب صبح کو اٹھا تو آنکھیں ملتا اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا اور اس کے اٹھے ہوئے گھٹنے پر اپنی ننھی سی ٹھوڑی رکھ کر مسکین آواز میں بولا۔

"ماں!"

اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ "کیا؟ ——"

"خربوزہ!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اس کی حقیقی ماں کی آنکھیں سوتیلی ماؤں کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر ننھے کے گال پر الٹے ہاتھ سے اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر چولہے کے پاس جا گرا۔ زار و قطار روتا وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا اور سوچنے لگا۔ اس دنیا میں پہلے سے ہی میرا باپ نہ تھا' اب میری ماں بھی کوئی نہیں۔ میں تو کوئی آوارہ بھکاری چھوکرا ہوں۔ جس گلی میں جاتا ہوں کتے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور جس سے بات کرتا ہوں وہ تیوری چڑھا لیتا ہے۔ بس اب آج کے بعد گھر نہیں جاؤں گا۔ ان کھیتوں سے نکل کر بہت دور چلا جاؤں گا۔ وہ جہاں اڑتی ہوئی کونجیں چڑیاں سی نظر آ رہی ہیں' جہاں ریلیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ بس وہاں —— نہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہ کسی کی چوری کروں گا۔ دن کو چلتے چلتے تھک جاؤں گا تو شیشموں کے تلے لیٹ رہوں گا۔ رات کو تھکوں گا تو نرم گھاس کے قطعوں پر سو رہوں گا۔ ماں کہا کرتی ہے کہ ہم سب کو رزق دینے والا خدا ہے۔ بس اس سے مانگوں گا۔ وہی میرا پیٹ بھر دے گا —— وہی خربوزے بھی لا دے گا۔" اور خربوزوں کا خیال آتے ہی وہ رک گیا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے رگڑ اس نے ہاتھ بلند کئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اے میرے اچھے خدا! میں تجھے یاد کرتا ہوں۔ پرسوں مولوی جی سے میں نے نماز کا سبق بھی لیا تھا اور مجھے کلمہ بھی آتا ہے اور میں بہت اچھا ہوں۔ اچھے خدا' اور تو یوں کر کہ مجھے آج اچھے اچھے پیلے پیلے خربوزے لا دے ضرور۔ میں آج ساری رات کلمہ پڑھتا رہوں گا اور پھر کبھی خربوزے نہیں مانگوں گا۔ اے میرے اچھے خدا —— اب میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ تو میرے سامنے خربوزے رکھ جا' لے۔"

اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے لبوں کے گوشے کانپنے لگے۔ نتھنے پھڑک گئے اور وہ مسکرانے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اللہ میاں اس کے لیے خربوزوں کی گٹھڑی باندھے آ رہے ہیں۔ قدموں کی چاپ نہایت تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ذہن پر اللہ میاں کا پاکیزہ ہیولیٰ ابھرا۔ سفید لباس' سفید بال' نورانی چہرہ' ایک سفید کپڑے میں پیلے پیلے خربوزوں کا ایک انبار باندھے وہ اس کے قریب آئے اور پھر —— اور پھر تڑاخ کی آواز آئی۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دھب سے نکیلے پتھروں پر گر گیا۔ اس پر سکتہ چھا گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو اللہ میاں کی جگہ سفید لباس پہنے سفید ریش بخشو کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور پریشانی میں وہ اپنی ڈاڑھی کو بار بار کھجلاتا تھا۔ گرج کر بولا۔

"شیطان کہیں کا' مجھ دیکھ کر آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ کھڑا ہو گیا جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ یوں کھیت میں گھسا آ رہا تھا جیسے اپنے باپ کی ریاست میں اینڈتا پھر رہا ہے۔ شیطان کہیں کا۔"

ننھا' جو خدا اور بخشو کے اس ہولناک تصادم سے گھبرا سا گیا تھا رونی صورت بنا کر بولا۔

"میں تو خربوزوں کی——"

اور بخشو اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔ "اور میں کب کہتا ہوں کہ تو یہاں نماز پڑھنے آیا ہے۔ خربوزوں کی تلاش ہی تو تجھے یہاں کھینچ لائی۔ پچھلے چند دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے جس نے میرے کھیت کا پوربی گوشہ تباہ کر ڈالا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں۔"

اور وہ روتا ہوا بولا۔ "میں تو آج ہی——"

"اور کل—— اور پرسوں؟" بخشو نے اپنا سر دائیں اور پھر بائیں کاندھے پر جھکا کر کہا۔ "کل پرسوں میں نے تجھے نہیں دیکھا اس لیے—— اٹھ بھاگ یہاں سے۔ اگر آج کے بعد تو پھر اِدھر آیا تو نگل جاؤں گا تجھے۔ بڑا آیا خربوزوں کا رسیا۔ اتنا شوق ہے تو ماں سے دو پیسے لے اور خرید لے جا کر خربوزہ۔"

ننھا اٹھا۔ اٹھتے ہوئے اس کی نظریں سامنے سارے کھیت میں گھوم گئیں اور بے شمار پیلے پیلے دھبے اس کے سامنے تیرتے ہوئے کہیں کھو گئے۔ سر جھکائے وہ پلٹا اور بہت دور جا کر ایک ننھی سی بیری کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ اس دنیا میں نہ تو اس کا کوئی باپ ہے اور نہ ماں—— اور نہ خدا—— اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ سسکیاں بھرتا ہوا وہیں سو گیا۔

وہ بہت دیر تک خربوزوں بھرے خواب دیکھتا رہا مگر اچانک جیسے اس کے منہ پر اللہ بخش نے تھپڑ مار دیا۔ ہڑبڑا کر اٹھا، دیکھا تو ماں کھڑی ہانپ رہی ہے۔ بڑی بڑی لال آنکھیں۔ پسینے سے شرابور چہرہ۔ پاؤں پر گرد جمی ہوئی۔ ہاتھ دوسرے طمانچے کے لیے تُلا ہوا۔

"لگاؤں دوسرا؟" لگاؤں یا گھر چلے گا؟ ارے کم بخت تو بخشو کا کھیت

اجاڑتا رہا ہے اور پھر بھی ہر وقت خربوزہ خربوزہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ ارے چوٹے تجھے شرم نہ آئی۔ اللہ بخشے تیرے باپ کو تو ایک روز پانچ روپے کا نوٹ گلی میں پڑا ملا تھا تو بھاگا بھاگا چوپال پر گیا، پوچھ گچھ کی اور جس کا نوٹ تھا اسے دے دیا۔ ایک کوڑی تک نہیں لی۔ گھر لے آتا تو بھیڑ بکری خرید لی جاتی لیکن اس کے من میں کھوٹ نہ تھا—— اور تو ایسا ناخلف، ایسا کپوت کہ خربوزے چُراتا پھر رہا ہے۔ زبان کا چسکا پورا کرنے کے لیے خاندان بھر کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے۔ بخشو ابھی ابھی میرے ہاں آیا تھا اور اتنی عورتوں کے سامنے میری ناک کاٹ کر وہ پھینکی۔"

ماں کی کف آلود ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہا لیکن ماں کی ناک کٹ جانے کی خبر سن کر اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ ماں کی ناک اسی طرح قائم تھی، اسی طرح لمبی اور جھکی ہوئی اور پھر اسے وہ سوراخ بھی نظر آ گیا جو شاید بچپن میں بلاق ڈالنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کی ماں بھی عجیب ہے۔ اس پر ایک جھوٹا الزام دھر رہی ہے اور خود اتنا بڑا جھوٹ بول رہی ہے۔

"ارے چلتا ہے گھر یا——" ماں کا ہاتھ بلند ہو کر تن گیا۔ انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔ وہ اٹھا اور ہولے سے بولا۔

"چلتا ہوں۔"

"چل میرے آگے۔" ماں نے اس کی گردن کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔ اور جب وہ بخشو کے کھیت کے قریب سے گزرا تو اس کی آنکھوں کے سامنے پیلے پیلے تارے سے تیرنے لگے جو آہستہ آہستہ رنگ بدلتے گئے اور جب وہ گھر پہنچا تو وہ تارے صحن میں پڑے ہوئے کنکروں میں تبدیل ہو گئے۔

گھر آ کر ماں نے اسے دلاسا دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے نون مرچ کے علاوہ

اس کے سامنے گڑ بھی تھا۔ ماں اسے پنکھا بھی جھلتی رہی اور یہ بھی کہا۔ "تُو تو میرا سب کچھ ہے۔ تو ہی تو میرا دھن دولت ہے۔ تجھی کے سہارے تو میں جی رہی ہوں۔ ورنہ کب کی کسی کھائی میں چھلانگ لگا گئی ہوتی۔ تو بڑا ہو گا۔ نوکر ہو جائے گا فوج میں۔"

"میں تھانے میں سپاہی بنوں گا۔" اس نے لقمہ چباتے ہوئے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

"ہاں ہاں۔" ماں مسکرا کر بولی۔ "میرا ننھا تھانے کا سپاہی بنے گا۔ سر پر لال پگڑی، ہاتھ میں ننھی سی چھڑی، پاؤں میں کالے کالے بوٹ۔ جدھر جائے گا لوگ زمین پر بچھتے جائیں گے اور پھر میرا لال چھٹی پر آئے گا تو میرے لیے اچھی اچھی چیزیں لائے گا۔ ریشمی کپڑے اور مٹھائیاں اور ـــــ"

"اور خربوزے بھی ـــــ!" اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ماں کے چہرے کی جھریاں گہری ہو گئیں اور پھر وہ بولی۔

"ہاں خربوزے بھی اور ـــــ"

اور ان باتوں کے دوران میں ننھا سوچتا رہا کہ ماں اس وقت بہت مہربان معلوم ہوتی ہے۔ اب میری ماں سچی ماں کے روپ میں ہے۔ کیوں نہ میں اس سے ایک خربوزہ لانے کے لیے کہہ دوں۔ لیکن اس کی نظریں اچانک اپنی ماں کے سوکھے ہوئے ہاتھ پر جا پڑیں جس کی انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں۔ تھوک نگل کر چپکا ہو رہا۔

لیکن خربوزوں کا بھوت اس کے سر پر اسی طرح سوار رہا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ ماں کو ایک خربوزے کے لیے کہہ دے۔ پرسوں ذیلدار جی کے گھر کی چکی پیس کر ایک آنہ لائی ہے۔ کیا ان چار پیسوں میں سے وہ ایک پیسے کا بھی حقدار نہیں۔ آخر اس کا پسا ہوا آٹا اٹھا کر وہی تو ذیلدار جی کی بیٹی کو دے آیا

تھا، اور اگر یوں نہیں تو کیوں نہ وہ بخشو والے جھوٹے الزام کو سچ کر دکھائے۔ چپکے سے گھس جائے کھیت میں اور اتنے خربوزے کھائے کہ ساری عمر اسے خربوزوں ہی کی ڈکاریں آتی رہیں۔ لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اچانک اس کے دماغ میں ماں کا اکڑا ہوا ہاتھ کلبلانے لگتا اور اس کے سارے ارادے ننھے ننھے ذرے سے بن کر ہواؤں میں کھو جاتے۔

ایک دن وہ ایک گلی میں خربوزے کے چھلکے دیکھتا گزر رہا تھا کہ اسے ذیلدار جی کی آواز سنائی دی۔

"اے ننھے ادھر آ۔" اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے کئی ہم عمر چوپال پر اکٹھے تھے۔ آخر آنکھیں جھپکاتا وہ ذیلدار جی کے پلنگ تک گیا اور بولا۔

"جی!"

ذیلدار جی بولے۔ "ہمارا بھوسہ آیا ہے آج۔ اس کوٹھے میں پڑا ہے۔ تم سب لڑکے اسے اچھی طرح لتاڑو تاکہ وہ نیچے بیٹھ جائے اور بھوسے کا ایک اور بورا بھی کوٹھے میں آ سکے۔ دو دو پیسے ملیں گے تم سب کو ـــــ لتاڑو گے؟"

"لتاڑوں گا۔" ننھا بولا اور ہر طرف خربوزوں کا موسلادھار مینہ برسنے لگا۔

سب لڑکے اندھیرے کوٹھے میں گھس کر بھوسے پر چڑھ گئے۔ بہت دیر تک کودتے ناچتے، گرتے اٹھتے رہے۔ بھوسے میں سے مہین دھول نکل کر ان کے بالوں، کانوں، آنکھوں اور منہ میں گھستی رہی۔ مگر دو پیسوں کا جادو انہیں اسی شدت سے نچاتا رہا۔ کسی کو ریوڑیاں یاد آ رہی تھیں تو کسی کو پیپرمنٹ، کوئی مصالحہ دار گڑ کے خواب دیکھ رہا تھا تو کوئی رنگ برنگے پتنگوں کے۔ لیکن صرف ایک دماغ میں خربوزے لڑھک رہے تھے۔ قدموں کے ہر دھمک کے

ساتھ کوئی اس کے کان میں کہتا۔ "خربوزہ۔"

اور وہ خوش ہو کر جی ہی جی میں کہتا۔ "خربوزہ نہیں تو کیا ریوڑیاں؟ دانت ٹوٹ جاتے ہیں چباتے چباتے۔ اور پیپر منٹوں سے کچی کچی بدبو آتی ہے اور مصالحہ دار گڑ میں مصالحے کی جگہ مکوڑے پڑے ہوتے ہیں اور پتنگ ایک جھٹکے سے کٹ جاتے ہیں کم بخت ——— ہم تو خربوزہ خریدیں گے۔ باہر سے پیلا اور اندر سے سفید یا سبز۔ ایک ایک پھانک میں لاکھ لاکھ مزے!"

بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا' کودتا رہا' ناچتا رہا' اور مہین دھول اس کی آنکھوں اور نتھنوں اور گلے میں گھستی رہی اور آخر جب ذیلدار جی مطمئن ہوگئے کہ بھوسا اس سے زیادہ نہ دب سکے گا تو سب ننھے ننھے بھتنوں کی طرح باہر نکلے' دو دو پیسے سب کی ہتھیلیوں پر رکھے جانے لگے۔ ننھا سب سے آخر میں تھا۔ وہ جونہی ہاتھ پھیلائے ذیلدار جی کے قریب آیا اور انہوں نے جیب سے ہاتھ نکالا تو وہ مٹھی بند کر کے کلیلیں بھرتا چوپال سے بھاگ نکلا۔

"ارے ننھے پیسے تو لیتا جا۔" ذیلدار جی ہنستے ہوئے بولے۔ اس نے رک کر مٹھی کھولی تو خالی تھی۔ اسے ذیلدار جی بڑے ست اور نالائق معلوم ہونے لگے جنہوں نے دو پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھنے میں تین گھنٹے لگا دیئے تھے۔

واپس آکر اس نے ذیلدار جی سے پیسے لیے مگر اس کا ہاتھ کانپ گیا اور پیسے نیچے گھوڑے کی لید میں گر گئے۔ نہایت پھرتی سے اس نے لید سے پیسے اٹھائے اور ڈھلوان پر سے لڑھکتے ہوئے کھلونے کی طرح خربوزوں والے شاموں کی دکان کی طرف لپکا۔

دور سے شاموں کو پکارا۔ "چچا شاموں ایک خربوزہ' دو پیسے کا ایک اچھا سا' بڑا سا پیلا سا خربوزہ!"

اور جب وہ چچا شاموں کے قریب پہنچا تو خربوزہ منتخب ہو چکا تھا۔ دو پیسے شاموں کے آگے پھینک کر وہ خربوزے کو بغل میں دبائے گھر کی طرف دوڑا۔ ایک جگہ اس نے ٹھوکر بھی کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ حلق پر جمی ہوئی دھول تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے "چیں چاں" بجنے لگی۔ گھر کے صحن میں قدم دھرتے ہی پکارا۔

"ماں ——— خربوزہ ———" اور اس کا حلق فرطِ مسرت سے گھٹ گیا۔ "خربوزہ ———!" وہ ایک بار پھر چلایا۔

اندر سے آواز آئی۔

"پھر وہی خربوزہ؟ ——— تیرا باپ دے گیا ہے مجھے خربوزے کہ تو ——— ارے خربوزہ ———"

اور ماں نے بڑھ کر خربوزہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گھمایا۔

"کہاں سے لایا؟ ———"

ننھے نے جب ماں کو سارا حال سنایا تو وہ بولی۔

"پیسے گھر لے آتا تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلتا ——— مگر خیر' تجھے شوق تھا ——— شکر ہے تیرے من کی آگ تو ٹھنڈی ہوئی ——— لے ذری چھری اٹھا لا ——— چولہے کے پاس پڑی ہوگی۔"

ننھا کودتا پھاندتا چولھے کے پاس گیا۔ چھری کے دھوکے میں دست پناہ اٹھا لایا۔ رستے میں پلٹ کر دست پناہ وہ پھینکا اور چھری اٹھا لی۔ ماں کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چھری خربوزے پر جھکی اور جب اس کی نوک خربوزے کے کلیجے میں داخل ہونے لگی تو ماں بولی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔" اور جی ہی جی میں ننھے نے بھی تین بار بسم اللہ شریف پڑھی ——— اور پھر ———!

پھر دونوں ٹکڑے الگ ہوگئے اور پانی کی ایک ندی سی فرش پر بہنے لگی۔ بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا سارا گودا پانی بن چکا تھا۔ اور بیج کالے رنگ کے ہوگئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔ خربوزے کو فرش پر پٹخ کر ماں نے انگلیوں کی پانچ سلاخوں سے ننھے کے گال پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ لڑھکتا لڑھکتا دیوار کے قریب جا رکا۔ چھلکے بوڑھی بکری نے بھی قبول نہ کیے۔

وہ روتا بلکتا سو گیا——— اور جب صبح کو اٹھا تو اس کے گلے میں "چیں چاں" سی ہو رہی تھی اور اس کے بدن سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

اور خربوزے کے چھلکے سے کالے کالے لم ٹنگے چیونٹے چمٹ رہے تھے اور بخشو کے کھیت میں——! ہر طرف پیلے پیلے دھبے سے ناچنے لگے۔ وہ چیخ مار کر تڑپا اور کھٹولے سے نیچے آ رہا!

*

نامرد

چاندنی رات مکمل سناٹے کے بغیر میرے نزدیک ایک نہایت دھندلی تصویر ہے، جس کے رنگ دھوئیں اور گرد نے چوس لیے ہوں۔ دن بھر کی چیخم دھاڑ اور ہائے وائے کے بعد بھی اگر زندگی کا بھوت اپنے بے ہنگم رقص اور چیختے چلاتے گھنگھروؤں سے چاندنی کی صاف سطح پر چرکے لگاتا پھرے، تو اس چاندنی سے وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا بھلا جس میں دل کی دھڑکنیں ہتھوڑے کی چوٹیں بن کر بجتی ہیں۔ نصف شب کے سیمیں سناٹوں میں مجھے نہ تو کوئل کی کراہیں پسند ہیں، نہ پپیہے کی ہچکیاں۔ آواز چاندنی کی لطافت پر چھا جاتی ہے اور چاندنی پر چھا جانے والی آفتوں سے تو ہر وہ انسان نفرت کرے گا جو چاند کے دودھیالے اجالوں میں نہایا ہو، اور نقرئی کرنوں کی بے آواز پھواروں میں بھیگتا پھرا ہو۔

اس شام کو، جب میں سامان باندھ کر تیار ہو بیٹھا اور امی میری ہتھیلی پر شکر رکھ کر میری بخیریت واپسی کے لیے آنسوؤں کی سیلن سے ٹھٹھری ہوئی دعائیں مانگ چکیں تو حویلی کے باہر مجھے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی جس میں ایک گھنٹی کی ٹنٹناہٹ بھی رینگ رہی تھی۔ اچانک ہش ہش کی مسلسل آوازوں سے چونک کر امی جان بولیں۔

"اونٹ آگیا میرے لال! اب سامان رکھوا لے تسلی سے، اور پھر اللہ کا

نام لے کر چل دے۔ دیر ہو گئی تو کل سارا دن اسٹیشن پر بیٹھنا پڑے گا۔ گاڑی صبح کی اذان ہوتے ہی نکل جاتی ہے۔"

اب مشکل یہ تھی کہ کجاوے کے ایک طرف تو مجھے بیٹھنا تھا، دوسری جانب توازن قائم رکھنے کے لیے سوٹ کیس اور بستر ٹھونس دیئے گئے۔ تجربتہً میں ایک طرف بیٹھا تو سامان والا حصہ اوپر اٹھ گیا اور اونٹ نے بلبلا کر اپنی دم کو اس تیزی سے ہلایا جیسے اس میں بجلی کی رو حلول کر گئی ہو، نتھنے پھڑکا کر اس نے گردن موڑی اور میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "سنبھل کر بیٹھو بچہ جی! تمہارے حصے کے کجاوے کی چولیں ہماری پسلیوں میں گھس رہی ہیں۔ سنبھل کر بیٹھو ورنہ ہمارے گنوں سے تو تم واقف ہی ہو۔ ہم نے کروٹ لی تو چر مر ہو کر رہ جاؤ گے۔"

اونٹ کی ہدایت معقول تھی لیکن بوڑھا ساربان نورا میرے کچھ کہنے سے قبل ہی ایک بھاری پتھر اٹھا لایا۔ اور بستر کے ایک طرف جما کر بولا۔

"اب بیٹھیے۔"

میں اونٹ کے چکنے جسم پر پاؤں جما کر دوبارہ کجاوے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔

"سلیم میاں!"

وہ بوڑھا ہادو تھا جس کی جھریوں میں پسینے کی لکیروں اور دھندلی آنکھوں پر جھکے ہوئے ابروؤں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دور سے آ رہا ہے۔ میرے قریب آ کر بولا۔

"اسٹیشن کو چلے ہو نا سلیم میاں! ابھی مجھے ایک لڑکے نے بتایا کہ سلیم میاں نے اونٹ لیا ہے بھاڑے پر۔ تو بیٹا، بات یہ ہے کہ میاں والی جیل میں ہے نا میرا بیٹا اللہ داد، دو سال ہوئے وہ ایک بلوے میں ——"

میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں چچا ہادو! اسے پانچ سال قید کی سزا ملی تھی۔"

ہادو نے اپنے جبڑے کو پوری طرح کھول دیا۔

"شکر ہے، تم غریبوں کو یاد رکھتے ہو سلیم میاں۔ اچھے باپ کے بیٹے ہو نا۔ خدا بخشے تمہارے ابا سے میرا بڑا گہرا یارانہ تھا۔ ایک دفعہ چکوال سے میرے لیے ریوڑیوں کی ایک گٹھڑی لے آئے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ ریوڑیاں کڑ کڑ بھی بولتی ہیں اور رس بھی گھولتی ہیں اور ——"

حویلی کے کواڑ کے پیچھے سے امی کی آواز آئی۔

"بیٹا دیر ہو چکی۔"

میں نے کہا۔ "چچا تم بھاڑے کے اونٹ کی بات کر رہے تھے۔"

وہ باچھوں کو کانوں تک لے گیا اور اپنے ٹھنڈے آہنی ہاتھ سے میری کلائی کو جکڑ کر بولا۔

"تو وہ لڑکا میرا، جیل میں ہے نا۔ بہو اس سے ملاقات کرنے جا رہی ہے۔ ساتھ دو اڑھائی سال کا ننھا بھی ہے۔ میں نے کہا، سلیم میاں اکیلا ہی تو ہے، کجاوے کے ادھر سلیم میاں بیٹھ جائے گا، ادھر بہو رانی بیٹھ جائے گی ننھے کے ساتھ، بیچ میں آ جائے گا سامان —— اور آدھا کرایہ ابھی دیئے دیتا ہوں۔"

میں امی کی رائے پوچھنے کے لیے بولا۔

"امی۔"

کواڑ کے پیچھے سے آواز آئی۔

"کیا ہرج ہے اور کرائے کی کیا ضرورت ہے۔ ہادو اپنا بھائی ہے۔"

"تیرا پردہ قائم رہے بہن!" ہادوں نے چادر کے کونے کی ادھ کھلی

گانٹھ کو مضبوط کر کے ایک طرف اڑس لیا اور پلٹ کر ہانک لگائی۔

"لاڈلی!"

ایک عورت چھم چھم کرتی نکڑ پر ظاہر ہوئی۔ اس نے سارا جسم کالی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اور شاید بچہ بھی کہیں چادر ہی میں تھا۔ اس سیاہ شکنجے میں اس کا جسم پھڑپھڑاتا معلوم ہوتا تھا جیسے شکاری کی کسی ہوئی تھیلی میں اچھلتے ہوئے خرگوش۔ ساربان بھی اس مسئلے کے اتفاقی حل سے بہت مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ فوراً سامان کو درمیان میں باندھا۔ میں حویلی میں جاکر اپنے ماتھے پر امی کے کے ہونٹوں کا سکون بخش مس لیے باہر آیا۔ لاڈلی اور میں ایک ساتھ کجاووں میں بیٹھ گئے۔ ہادو نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اونٹ نے لٹکتے ہوئے ہونٹوں کو پھڑپھڑایا جیسے اطمینان کا اظہار کر رہا ہو۔ کواڑ کے عقب سے عربی دعاؤں کی سرسراہٹیں نکل رہی تھیں اور ادھر ہادو پکار رہا تھا۔

"فی امان اللہ۔ خیر سے جاؤ' خیر سے آؤ لاڈلی بٹیا! سویرے سویرے ملاقات ہو جائے تو تیرا چچا نورا ہی تجھے لیتا آئے گا واپس۔ کیوں نورے؟"

میں نے جلدی سے کہا—— "لیتا آئے گا—— لیتا آئے گا۔ آخر اسے واپس ہی تو آنا ہے۔ پل بھر رک جائے گا۔ سیر کر لے گا بازار کی۔"

"پہلے بھاڑا چکا لو چچا۔"

نورا بات کا کھرا سہی۔ مگر مجھے اس کی یہ جلد بازی اور بنیا پن برا لگا۔ میں نے ذرا سختی سے کہا۔

"بھاڑے کی فکر نہ کرو۔"

اور پرلی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے چند گبھروؤں نے سارسوں کی طرح گردنیں بڑھا بڑھا کر کچھ ایسی سرگوشیاں کیں' جیسے انہیں شربت کے مٹکے میں سانپ رینگتا نظر پڑ گیا ہو۔

اونٹ کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز بے ڈھنگے سہی' مگر صعود و قعود کی شاہراہوں پر ایسے کئی موڑ آتے ہیں' اونٹ اٹھا۔ ایک پل کے لیے جم کر رہ گیا جیسے پرسکون سفر کی دعا مانگ رہا ہو' اس کے بعد جسم کو بھدی سی حرکت دی' جیسے توازن کا اندازہ لگا رہا ہو۔ دُم کی برقی لہریں جاگ اٹھیں۔ اس کے بعد ہونٹ پھڑپھڑائے اور پھر چلا ہی تھا کہ میں پکارا۔

"بھئی نورے! یہ گھنگھرو اتار لے' اور گھنٹی کس کر باندھ دے اونٹ کی گردن سے' خدا جانے تم لوگ یہ حرکتیں کیوں کرتے ہو' اچھے خاصے سفر کا ستیاناس کر دیتی ہیں یہ تیز آوازیں۔ اتار لے انہیں۔"

نورے نے مہار کو زمین پر پھینک کر میری طرف دیکھا اور پھر بڑھ کر گھنگھرو کھول لیے۔ زمین پر سے چیتھڑا اٹھا کر گھنٹی میں ٹھونس دیا اور مہار سنبھالتے ہوئے بولا۔

"سلیم میاں سچی بات کہوں۔ گھنگھرو اور گھنٹی کے بنا اونٹ کی سواری' اونٹ کی سواری نہیں رہتی۔ اس سے تو بھینسے کی سواری بھلی۔"

میں نے کہا۔ "اونٹ ہو کہ بھینسا۔ مطلب آدھی رات کو اسٹیشن پر پہنچنے سے ہے' یہ ٹناٹن میرا دماغ چاٹ لے گی' اب چلو۔"

"ہاں ہاں بھئی" ہادو بولا۔ "آج چودھویں تاریخ ہے۔ چاند گھڑی مار کر ابھرے گا۔ چاند کی راہ نہ دیکھو۔"

"ہاں بھئی چاند کی راہ نہ دیکھو۔ ہم سرکاری ذخیرے کے پاس پہنچیں گے تو شاید تبھی ابھرے گا چاند۔"

مگر نکڑ پر کھڑا ہوا ایک گبھرو بولا۔ "وہ ابھر تو رہا ہے طباق سا۔"

"فی امان اللہ۔" کواڑ کے پیچھے سے آواز آئی۔

"خیر سے جاؤ' خیر سے آؤ!" ہادو بولا۔

"السلام علیکم۔" ہجوم پکارا۔

"بسم اللہ!" نورا بڑبڑایا۔

اور اونٹ گلی سے نکل کر چراگاہ میں پہنچ گیا۔

چاند ہمارے بالکل سامنے تھا۔ گول مول اور تندرست، جیسے ابھی ابھی کسی نورانی جھیل میں ڈبکی لگا کر اچھلا ہو۔ چراگاہ کا سبزہ سیاہی مائل نظر آتا تھا۔ اور اس سیاہی میں سبک پگڈنڈی، گھنے بالوں میں باریک مانگ کی طرح چمک رہی تھی۔ سارے ماحول پر نیندوں نے ہجوم کر رکھا تھا۔ ساربان کل وار گڈے کی طرح مہار سنبھالے چلا جا رہا تھا اور لاڈلی؟

میں کجاوے میں ذرا آگے سرک گیا۔ اور گردن بڑھا کر لاڈلی کی طرف دیکھا۔ اس کی کالی چادر ماتھے سے بھی اوپر سرک گئی تھی۔ اس کے چہرے کی چاندنی نے چاند کی چاندنی میں گھل مل کر ایک عجیب سا نورانی جالا بن رکھا تھا جس کو ایک طرف ہٹانے کے لیے میری نظروں کو کافی مشقت کرنا پڑی۔

میں نے کہا "ایں —— تم نے نیچے کوئی چادر وادر بھی بچھا رکھی ہے لاڈلی؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ کالے بالوں کی مانگ اور سیاہ سبزے کی پگڈنڈی دونوں نے گھل مل کر میرے ذہن پر عجیب سی آڑی سیدھی لکیروں کا انبار لگا دیا۔ لاڈلی کچھ دیر خاموش رہی، جیسے بولنے کی کوشش کر رہی ہے مگر زبان کو مناسب الفاظ سہارا نہیں دیتے۔

میں پھر چکا "میں نے کہا لاڈلی، کیا کوئی چادر ——"

ہچکچاتی ہوئی آواز میں بولی "چادر تو نہیں جی —— پر ویسے بھی آرام سے بیٹھی ہوں۔"

میں نے اپنے چار طرف ٹھنسے ہوئے گدوں میں سے ایک گدا نکال کر

اس کی طرف بڑھایا۔

"بھئی واہ! یہ بھی کیا بات ہوئی۔ یہ گدا لے لو تم۔ اتنا لمبا سفر ہے اور پھر رات کا سفر ہے، اتنے موٹے بان سے کجاوا بنا ہے نورے نے، نیند کیسے آئے گی ننھے کو، اور تمہیں؟ ——"

اس نے گدا لے لیا اور ساتھ ہی بولی۔ "ننھا تو سو رہا ہے جی، اور مجھے سفر میں نیند نہیں آتی۔"

"مجھے بھی نہیں آتی۔"

—— اچانک نیندوں بھری فضاؤں میں ٹنٹناہٹوں کے کوندے لپک گئے۔ نورا ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی اونٹ بھی رک گیا۔ "چیتھڑا گر گیا گھنٹی میں سے۔" وہ مہار کو زمین پر پھینک کر بولا۔

"بجنے دو!" میں نے کہا۔

"جی؟" نورے نے چیتھڑا اٹھا کر پوچھا۔

"میں کہتا ہوں بجنے دو!"

"چیتھڑا تو مل گیا مجھے۔"

"میں کہہ رہا ہوں پھینک دو چیتھڑا، بجنے دو گھنٹی کو۔"

"یعنی —— ایں —— اچھا" اور چیتھڑا پھینک کر جب اس نے مہار سنبھالی تو پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اور میں سمجھا، میرے سر میں سینگ اگ آئے ہیں۔

"میں بھی حیران تھی آپ نے گھنٹی کیوں بند کرا دی چلتے وقت؟" وہ شاید بچے کو گود سے اتار کر گدے پر لٹا رہی تھی۔

میں اس بات کا جواب نہ دے سکا۔ اس کی حیرت بجا تھی لیکن ذہن کے سمندر میں بھی مدو جزر ہوتا ہے۔ اور مدوجزر چاند کی کشش کا نتیجہ ہے۔

اور چاند—— لیکن اب تو چاند کے چہرے پر پرچھائیاں سی پڑ رہی تھیں۔ اور ذہن کے سمندر کا مدوجزر اپنے عروج پر تھا۔ تو پھر یہ کسی اور چاند کی کشش ہے۔ اس نئے چاند کی چاندنی پر گھنٹی کی ٹنٹناہٹ چڑ کے نہیں لگاتی۔ اس کی جادو اثری میں اضافہ کرتی ہے۔ گھنٹی کی آواز ایک گیت ہے۔ اچھوتا اور مسلسل' جو فطرت کے لبوں سے نکل رہا ہے۔ اپنے وہی بچوں کا جی بہلانے کی خاطر۔ اس گیت میں میرے لیے ایک پیغام تھا۔ ایک دعوت تھی—— میں اس کے مترنم الفاظ کو سمیٹ کر من مانی ترتیب دینے لگا۔ گھنٹی کہہ رہی تھی' "رات کا وقت ہے۔ چاند چمک رہا ہے' ستارے لجا رہے ہیں' ہواؤں میں انگڑائیاں ہیں' فضاؤں میں نیندیں گھل رہی ہیں' سفر لمبا ہے' ساربان بوڑھا ہے' اور بڑھاپا اپنے گردوپیش سے بیگانہ رہتا ہے' سبک پگڈنڈی دور چاندنی کی کہر میں ڈوبتی نظر آتی ہے' کجاوے ڈول رہے ہیں۔ لاڈلی کا بچہ سو رہا ہے اور لاڈلی جاگ رہی ہے کیونکہ اسے سفر میں نیند نہیں آتی' تجھے بھی سفر میں نیند نہیں آتی۔ دو جاگنے والے آپس میں باتیں نہ کریں تو یہ سمجھو' کہ ان کے دلوں میں چور ہے۔ سفر باتوں سے کٹتا ہے اور باتوں کی حد بندی نہیں ہوسکتی۔ ذرہ' تنکا اور پھول جنگل' میدان اور پہاڑ' ندی' دریا اور سمندر' ہوا' فضا اور خلاء' ستارے' چاند اور آسمان اور آسمان سے پرے کی دنیا' اور اس دنیا سے پرے ایک اور دنیا —— سب کے متعلق باتیں ہوسکتی ہیں اور ان کے علاوہ—— ان کے علاوہ۔"

گھنٹی نے یہاں پہنچ کر علاوہ علاوہ کی رٹ لگا دی' اور میں سوچنے لگا کہ ان کے علاوہ بھی تو بے شمار موضوعات ہیں۔ مثلاً یہ اونٹ' یہ کجاوہ اور پھر یہ لاڈلی جس کا خاوند دو برس سے جیل میں ہے' جس کا بچہ سو رہا ہے اور جس کے چہرے کی چاندنی چاند کی چاندنی میں گھل مل کر ایک عجیب سا نورانی جالا بُن رہی

ہے۔

اگر مسافر اور منزل کے درمیان اونٹ کا کوہان حائل نہ ہوتا تو شاید گھنٹی کو علاوہ علاوہ کی رٹ نہ لگانا پڑتی۔ اس لیے میں دیر تک سوچتا رہا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پرلے کجاوے میں آگ جل رہی ہے اور میں اس کی آگ میں پگھلا جا رہا ہوں۔ کبھی کبھی پرلے کجاوے میں برف کے ایک تودے کا گمان ہوتا جس کی یخ بستگی میرے خیالوں کو جکڑ لیتی' اور میں بے دم ہو کر ٹھٹھر کر رہ جاتا۔ مصیبت یہ تھی کہ ستاروں اور چاند کے علاوہ بات کرنے کا کوئی اور موضوع ہی نہیں سوجھتا تھا اور اونٹ نہایت تیزی سے سبک پگڈنڈی کو اپنے قدموں سے لپیٹتا جا رہا تھا۔ سرکاری ذخیرہ قریب آچکا تھا' اور رات بڑی تیزی سے صبح کے غار کی طرف لپکی جا رہی تھی۔ فطرت فرصت تو دیتی ہے' مگر ان فرصت کے لمحوں کو طول نہیں دیتی۔ انسان ان لمحوں سے اس مختصر سے وقفے میں سب کچھ اخذ کر لینا چاہتا ہے' اس لیے جلد باز ہے' اور میں بھی جلد بازی کا مرتکب ہوا۔ میں نے ہولے سے کہا۔ "لاڈلی! یہ تمہارا نام بھی خوب ہے!"

بولی۔ "جی! یہ نام تو مجھے چچا نے دیا ہے' پیار سے۔ اصل میں تو میرا نام چنوں ہے۔"

"چنوں——! یعنی چاند کی بیٹی!" میں نے سوچا اور پھر کہا۔

"چنوں—— یعنی چاند—— یا چاند کی لاڈلی۔" میں نے جلد بازی کی تھی' اور مجھے شعلے کے بھڑک اٹھنے کا ڈر تھا' مگر چنوں بولی۔

"جو کچھ سمجھ لیجئے جی' پر میرا نام ہے چنوں۔"

میں نے کہا۔ "چنوں! تم اپنے شوہر کے بغیر بہت اداس رہتی ہوگی۔ دو برس سے وہ تم سے جدا ہے' اور ابھی تین برس باقی ہیں۔"

وہ خاموش رہی' اور جھک کر جیسے بچے کو تھپکانے لگی۔ اونٹ بڑبڑایا

اور ڈھیلی مہار سے فائدہ اٹھا کر چلتے چلتے میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہے۔ "میں سب کچھ سمجھتا ہوں بچہ جی!" اس کی اس حرکت سے گھنٹی کی آواز میں بھی چند ہچکولے سے پیدا ہوئے اور نورے نے پلٹ کر مہار کو کھینچتے ہوئے کہا۔

"ابے چل بھی' ابھی دو کوس چلا ہے اور بڑبڑانے لگا ہے لاڈلا!"

چنوں گنگنانے لگی۔ میں زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور کل دار گڈا قہقہہ لگا کر بولا۔

"نسیم میاں! اتنے بڑے جانور کو لاڈلا کہنا' ہے تو بڑی عجیب سی بات' پر یہ اللہ جیتا رکھے اسے ——— ہے بڑا لاڈلا!"

اور میں نے چنوں سے کہا۔

"شکر ہے میں نے اس سے پہلے ہی تمہارا نام پوچھ لیا تھا۔"

وہ اسی طرح گنگنائے جا رہی تھی' کچھ دیر بعد بولی۔

"نورے کا اونٹ لاڈلا ہے۔ چچا کی میں لاڈلی ہوں' میرا ننھا لاڈلا ہے' لاڈ پیار ہی سے تو دنیا چل رہی ہے۔"

میں نے اس کی تائید کی۔ "ہاں چنوں! لاڈ پیار ہی تو جینا ہے۔"

اس ذرا سی بات نے بہت سے عقدے حل کر دیئے۔ گھنٹی بھی علاوہ علاوہ کے ٹیلے پھاند گئی تھی' اور جب ہم سرکاری ذخیرے میں داخل ہوئے تو میرے ذہن میں ایسی بے ربط مسلسل آوازیں پیدا ہونے لگیں' جیسے سانپ کو دیکھ چڑیوں کے غول دیواروں سے چٹ چٹ کر چیختے ہیں۔ اب پھر مجھے موضوع کی تلاش تھی۔ کہ اچانک ایک درخت کی ٹہنی میرے کجاوے کے ساتھ چھررر سے رگڑ کھا گئی اور نورا پکارا۔

"خبردار ———!"

"بڑا گھنا ذخیرہ ہے!" میں نے نورے اور چنوں دونوں کو مخاطب کیا تھا۔ مگر جواب چنوں ہی نے دیا۔

"کسی کو ایک ٹہنی تک نہیں کاٹنے دیتا سپاہی' جب یہاں کوئی شخص قدم تک نہیں دھر سکتا' تو آپ سے آپ گھنا ہوگا ذخیرہ!"

میں نے کہا۔ "ہاں کانٹ چھانٹ ہوتی رہے' تو کجاووں کا راستہ بنا رہے۔"

وہ بولی۔ "اس کی کون پروا کرتا ہے جی؟"

ناگاہ میں کجاوے میں جیسے اچھل پڑا۔ یہ گھنا جنگل' اور یہ کانٹ چھانٹ اور یہ بے پروائی اور ——— گھنٹی کی ٹنٹناہٹ نے کہا۔ "تیرا خیال درست ہے ——— درست ہے ——— درست ہے!"

اور میں نے لمحات فرصت کے اختصار سے ڈر کر پھر جلد بازی سے کام لیا۔ اور کوہان کے ادھر سے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "لاڈلی ——— یعنی چنوں ——— !"

وہ میرے گول مٹول بازوو اور پھیلی پھیلی انگلیوں کو دیکھ کر پل بھر خاموش رہی' میں نے فوراً نشانے پر تیر مارا۔

"ننھا مجھے دے دو! اب کچھ دیر تک یہ میرے پاس رہے گا۔ تم پاؤں پسار لو' سو جاؤ' سفر لمبا ہے!"

بولی۔ "مجھے تو سفر میں نیند نہیں آتی۔ میں آرام سے بیٹھی ہوں۔ ننھا سو رہا ہے مزے سے' رہنے دیجئے۔"

میں نے ہاتھ کو کچھ اور بڑھا کر کہا "نہیں نہیں' مجھے دے دو ننھا۔"

اس نے اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو روکتے ہوئے کہا۔ "رہنے دیجئے' آپ کو تکلیف ہوگی!"

ننھا تو خیر مزے سے سویا رہا۔ مگر مجھے ننھے کی جگہ چنوں کا ہاتھ مل گیا۔

میں نے کنول کے پھولوں کو بھی چھوا ہے' اور نرگس کے ڈنٹھلوں کو بھی' مگر اس کی ہتھیلی کنول سے زیادہ گداز اور اس کی انگلیاں نرگس کے ڈنٹھلوں سے زیادہ سبک تھیں۔ ان میں آنچ بھی تھی اور خنکی بھی۔ اور جیسے اس ہاتھ کی ساری رگیں لرز رہی تھیں۔ میں اس لرزش کی آواز تک سن سکتا تھا۔ جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کا طواف کرتے ہوئے سرسراتی اور بھنبھناتی ہیں۔ بہت دیر تک وہ ہاتھ میرے ہاتھ میں یا میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہا۔ اور ہم دونوں خاموش رہے اور گھنٹی بجتی رہی' اور اونٹ چلتا رہا۔ اور کلدار گڈا جیسے مشی فی النوم کا شکار ہو گیا اور کبھی کبھی کوئی نرم ڈالی چھرر سے کجاوے کو سہلا کر ہمارے پیچھے ڈولتی رہ جاتی تھی۔

اچانک ننھا رونے لگا۔ میں نے کہا۔ "آنکھ کھل گئی ننھے کی۔" اور میں نے اپنا ہاتھ کھینچا۔

"سو جائے گا۔" وہ بولی اور میری انگلیوں کو جکڑ لیا۔

لیکن ننھا اب چیخنے لگا تھا۔ میں اپنی انگلیوں کو کھینچ تان کر بولا۔ "ننھے کو سلا دو چنوں!"

اس نے بے دلی سے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "بچے روتے ہی رہتے ہیں' سو جائے گا۔"

بازو بہت دیر تک تنے رہنے سے دکھنے لگا تھا۔ اور اب اسے سہلانے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ اسے پھر سے تان لیا جائے۔ دل و دماغ میں خیالوں اور وسوسوں کی عجیب بے ہنگم اچھل کود جاری تھی۔ میرا ہاتھ دیر تک اسی طرح پڑا رہا اور ذہنی جمناسٹک تیز ہونے لگی۔ اب بات کا موضوع تلاش کرنے کی مشکل درپیش تھی کہ اچانک اونٹ نے گردن موڑ کر ایک درخت کی بہت سی شاخوں کو اپنے جبڑے میں لپیٹ لیا۔ نورے نے چونک کر مہار کو کھینچا اور بڑبڑایا۔

"اپنے گھر سے بھوکا چلا تھا؟ ٹھونس ٹھونس کر تو اٹھا تھا سفر کے لیے' لاڈلا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لاڈلی!! سنا؟ ——"

اور جیسے معاً" اس نے میرا ہاتھ دیکھ لیا۔ اپنے ہاتھ سے اسے چھو کر بولی۔ "جی سنا۔ پر میرا نام چنوں ہے۔"

"اور لاڈلے کا نام اونٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "لاڈلا تو اسے صرف نورا ہی کہتا ہے پیار سے!"

وہ ہنسنے لگی۔ چادر اس کے سر سے ڈھلک گئی۔ اور میرے دل و دماغ میں خیالوں کے ہجوم کی اچھل کود رک گئی۔ مگر سرسریاں سی رینگنے لگیں۔ معمول سے بھی زیادہ ست رفتار سے۔ ہمارے ہاتھ بھینچ گئے۔ اور پھر ننھا رونے لگا۔

اونٹ ذخیرے سے نکل چکا تھا۔ اور اب اونچے نیچے رستے پر سنگریزے اونٹ کے پاؤں سے ٹکرا کر ادھر ادھر لڑھکنے لگے تھے۔ ہوا تیز ہو رہی تھی اور چاند کے آس پاس میلا سا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ میں نے ایک بار چنوں کی طرف دیکھا تو تیز ہوا میں اس کے بالوں کی چند لٹیں اس کے چہرے پر بکھر کر تڑپ رہی تھیں۔ اور پھر جب چاند کی طرف دیکھا تو اس پر میلے بادلوں کی لہریں سی چھا رہی تھیں۔

"خدا خیر کرے۔" میں نے کہا۔ "چاند میلا ہو رہا ہے۔"

چنوں بولی۔ "کہیں بارش نہ آلے۔"

میں نے بلند آواز سے نورے کو مخاطب کیا۔ "چچا! ہوا بڑی شوخ ہو رہی ہے۔"

وہ پلٹے بغیر بولا۔

"میں بھی ڈر رہا ہوں سلیم میاں! بھادوں کے بادلوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابھی اٹھتے ہیں، ابھی برس جاتے ہیں۔"

چنوں اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر چنوں مسکرا دی، بھادوں کے بادلوں میں لپکتے ہوئے کوندے کی طرح!

نورے نے اونٹ کی رفتار بہت تیز کر لی۔ کجاوے اب تک ڈول رہے تھے۔ اب ہچکولے کھانے لگے۔ ننھا جاگ اٹھا، چولیں چرچرانے لگیں۔ اونٹ کے کوہان پر بستر کی رسی ڈھیلی ہو گئی اور بستر جھولنے لگا۔ چاندنی رات مدھم پڑی اور پھر مر گئی۔ اور میں نئی بات کا موضوع تلاش کرنے لگا۔ مگر اب جو بات شروع ہوتی تھی وہ فوراً ختم ہو جاتی تھی کیونکہ ہر ندی، سمندر کا رخ کر لیتی تھی اور سمندر گہرا تھا اور میں اچھا تیراک نہ تھا۔ غوطہ کھانے کے خوف سے جلد ہی پلٹ آتا۔ اور پھر ایک نئی ندی مجھے اپنی لہروں میں بہاتی سمندر میں جا گرتی۔ مگر ساحل سے چند مرمریں سیپیاں چن کر میں کھلنڈرے بچے کی طرح پھر نقطۂ آغاز کی طرف لوٹ آتا۔

اب ہم اسٹیشن سے ایک میل دور تھے۔ ہوا کی تیزی نے شدت اختیار کر لی۔ بادل بج اٹھے، بجلی کی چمک سے اسٹیشن کی عمارت جیسے دور ابھر کر اندھیرے میں کھو گئی۔ لیکن اب چاندنی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کا امتیاز مٹ چکا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آوارہ بوند بھی آگرتی تھی۔ اور ننھا کھل کھلا کر ہنس پڑتا تھا اور جب تیز ہوا میں چنوں کی چادر پھڑپھڑاتی تو وہ ڈر کے مارے بسورنے لگتا۔ اونٹ کی رفتار حیرت ناک ہو گئی تھی اور نورا بڑبڑا رہا تھا۔

"کیسا گرجتا گونجتا اٹھا ہے بادل۔ اللہ کرے جمال پوٹر گھر پر ہی ہو، اس کے کواٹر میں بیٹھ رہیں گے۔ ابھی تو بہت رات باقی ہے۔"

جمال پوٹر ہمارے گاؤں کا ایک غریب بوڑھا تھا جو مدت سے اسٹیشن پر کام کرتا تھا۔ اس کا کوارٹر وقت پڑے ہمارے علاقے کے مسافروں کی پناہ گاہ بن جاتا تھا۔ جب ہم اسٹیشن کے قریب پہنچ کر جمال کے کوارٹر کے سامنے رکے تو گنجان بوندیں پڑنے لگی تھیں اور بادل دھاڑ رہا تھا۔ نورا چلّایا۔

"اے بھئی جمال پوٹرا!"

بہت دور سے جواب آیا۔

"کون ہے بھئی ——" اور پھر ایک اندھی سی بتی نے آنکھ ماری، اور آواز آئی "آیا ——" جمال دوڑتا ہوا آنکلا۔ ہمارے قریب آکر اس نے بتی اوپر اٹھائی، نورے کو پہچان کر اس سے مصافحہ کیا۔ اور جب میرا نام سنا تو بولا۔

"ارے بھئی اونٹ کو بٹھا بھی۔ اوپر بھیگ رہے ہیں سلیم میاں۔ السلام علیکم سلیم میاں، جیتے رہو بیٹا —— میں تو پردیسی ہو جانے پر بھی تمہارے گھر کا نمک نہیں بھولا۔ ارے نورے بٹھاؤ بھی اونٹ کو۔" اور اس نے خود ہی مہار کھینچ کر ہش ہش کی گردان شروع کر دی۔

"تمہارا حکم نہیں مانے گا۔" نورا بولا۔ "ادھر لا مہار۔ بڑا لاڈلا ہے یہ۔" اور چنوں اور میں ہنس پڑے۔ صعود سے قعود کی منزلیں طے کر کے لاڈلا بیٹھ گیا۔ میں جلدی سے کجاوے سے اترا۔ جمال سے ہاتھ ملایا اور اسے اس طرف کا کجاوا تھامنے کو کہا۔ پرلی طرف جا کر میں نے ننھے کو سنبھالا۔ اور پھر جب چنوں اتر چکی تو جمال بولا۔ "اندر چلو، پھٹ پڑا ہے بادل۔"

ہم کوارٹر کے ساتھ ہی برآمدے کی صورت میں بنے ہوئے چھپر تلے آ گئے۔ نورا سامان اور گدے اٹھا لایا۔ جمال کوارٹر کے اندر سے دو چارپائیاں گھسیٹ لایا اور چھپر تلے بچھا دیں۔ نورے نے پرلی طرف گدے پھیلا دیئے۔

جمال نے خاطر تواضع سے فارغ ہو کر کہا۔ "یہ بہن کون ہے؟"

میں نے کہا "چچا ہادو کی بہو——"

"اچھا چنوں بیٹی!" اس نے لاڈلی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "بیچاری دکھوں کی ماری۔ کتنے برس کاٹ لیے اللہ داد نے؟"

"دو——!" لاڈلی نے بچے کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہا۔

اور جمال کوارٹر کے دروازے کو بھیڑتے ہوئے بولا۔ "باقی بھی کٹ جائیں گے۔ مصیبتوں کا کیا ہے، بھادوں کے بادلوں کی طرح آتی بھی ہیں، گزر بھی جاتی ہیں، اور اللہ داد جوانمرد ہے۔ ہنس کھیل کر کاٹ لے گا باقی مدت —— اچھا تو سلیم میاں! میں گاڑی کے وقت تمہیں جگا دوں گا۔ پانی وانی کی ضرورت ہو تو اندر پوربی کونے میں پڑا ہے گھڑا۔ کٹورا بھی وہیں کہیں ہو گا۔"

نورا کجاوا اتار کر چھپر تلے لے آیا۔ اونٹ کا گھٹنا باندھ کر مہار ایک پیڑ سے اٹکا دی۔ اور بھیگا ہوا چولا اتار کر دھم سے گدوں پر گر گیا۔ چنوں بھی ایک چارپائی پر ہو بیٹھی۔

میں نے کہا "میرا بستر پڑا ہے اندر۔ وہ کھول کر بچھائے دیتا ہوں ننھے کے لیے۔"

مگر وہ بولی "سو رہے گا، ویسے بھی سو جائے گا۔ بچوں کی نیند کھڑی کھاٹ کی پروا نہیں کرتی۔ رہنے دیجیے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں نہیں! جب بستر موجود ہے، تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے، چچا نورے! ذرا اندر آنا۔ بستر کھولنا ہے۔"

لیکن چچا نورا تو خراٹے لے رہا تھا۔ بارش بہت زور سے پڑنے لگی تھی۔ اور ننھا مزے سے سو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "خیر میں خود ہی کھولے لیتا ہوں۔"

اور میں اندر چلا گیا۔

وہ بھی اندر بھاگی آئی۔

"آپ خواہ مخواہ تکلیف کر رہے ہیں۔ اچھا میں کھولے دیتی ہوں بستر!"

اور جب میں نے بستر کا ایک چھلا اتارا تو دوسرے چھلے کی تلاش میں وہ بستر کو ٹٹولنے لگی۔ اور پھر ہم نے ایک دوسرے کی باہوں کو جکڑ لیا۔ شہد کی مکھیاں چھتے کے اردگرد سرسرانے لگیں۔ میرے کانوں کی گونج بادل کی گڑگڑاہٹوں سے ٹکر لے رہی تھی۔ میں نے پھر اپنی فطری جلد بازی سے کام لیا۔ کلائیوں کو چھوڑ کر اس کے شانوں کو پکڑ لیا۔ وہ شاید اسی انتظار میں تھی۔ اپنی بانہوں کو اتنی مضبوط سے میرے اردگرد لپیٹ لیا کہ میری پسلیاں کڑمڑ بج اٹھیں۔ اور میں نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹوں کو اس کے چہرے کے نہ جانے کس مقام پر پیوست کرتے ہوئے بستر کو ٹھوکر لگا دی۔

اور پھر معاً باہر ننھا بلبلا اٹھا۔

میں نے چنوں سے الگ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔۔

"آنکھ کھل گئی ننھے کی۔"

"سو جائے گا!" وہ جیسے مجھے تسلی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "ننھے کو سلا دو چنوں۔"

اور اس نے اپنے ساتھ مجھے بھی گول بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"بچے روتے ہی رہتے ہیں، سو جائے گا۔"

لیکن اب تو بچہ جیسے کھاٹ پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ میں نے بھڑک کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"چنوں، نورا جاگ اٹھا یا جمال آنکلا تو؟"

"تو کیا؟" اس نے میرے ہاتھ کو کھینچا۔ "تم عجیب ڈرپوک ہو سلیم میاں——ارے بیٹھو بھی——"

میں اس کے ہاتھ کو گھبراہٹ اور غصے سے جھٹکتا باہر آگیا۔ وہ بھی میرے پیچھے چلی آئی اور بچے کو گھسیٹ کر کولھے پر رکھ لیا۔ نورا اسی طرح خراٹے لے رہا تھا۔ اور بچہ خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن اب جیسے میں اس کے قریب گیا تو بھڑک کر راکھ ہو جاؤں گا' مجھ پر ایک عجیب سا لرزہ طاری تھا۔ میں چھپر سے نکل کر باہر چلا آیا۔ بارش کے تیز جھالے آن کی آن میں میرے کپڑوں سے پار ہوگئے۔ میرے بال بھیگ کر لٹک آئے' اور میری آنکھوں میں چبھنے لگے۔ پلیٹ فارم پر سے تیزی سے گزرتا میں مسافر خانے میں گھس گیا۔ جہاں ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی' جمال ایک کونے سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور بولا۔

"ارے سلیم میاں! کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں سگریٹ خریدنے آیا ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "یہاں سگریٹ کہاں میاں! حقہ سلگا دوں؟"

اور میں ایک بینچ پر دھب سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "نہیں حقے کی ضرورت نہیں۔ تم کوارٹر سے میرا سامان اٹھا لاؤ۔ وہاں میرا جی نہیں لگتا۔ اور یہ لو دو روپے' یہ نورے کو دے دینا واپسی کے لیے۔"

لیکن جب جمال بڑی سی بوری اوڑھے میرا سامان لے آیا تو دو روپے میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور بولا۔ "چنوں نے نہیں لینے دیئے۔ وہ حرامزادی تو عجیب بکواس کر رہی تھی۔"

میں نے بھڑک کر کہا۔ "کیا کہتی تھی وہ؟"

جمال سوٹ کیس پر بستر رکھ کر بولا۔ "اب کیا کہوں سلیم میاں' گلے

میں پھندا پڑ رہا ہے۔ بکتی تھی حرامزادی' سو جاؤ تم——بڑا جوانمرد لیے پھرتی ہے اپنے اللہ داد کو۔ جب سے آنکھ کھولی ہے' جوتیاں کھاتا پھرتا ہے دشمنوں سے——سو جاؤ سلیم میاں!"

سائے

غروب آفتاب کے بعد جب پربتوں میں نصف چاند کی زرد روشنی سنسنانے لگی اور دور ایک گھاٹی میں ایک جھرنے کے کنارے مینڈک بے سُری اڑانے لگے تو وہ ماں باپ کی کھاٹوں کے قریب سے لہنگا سمیٹتی کھسک کر جھونپڑے کی دہلیز تک آئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تنگ پگڈنڈی کے اس موڑ کو دیکھنے لگی جس کے پاس ایک صاف چوڑی چٹان پر اس کے خواب منڈلا رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے پگڈنڈی کا موڑ کسی نامعلوم روشنی سے جگمگا اٹھا۔ اور اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان اپنے خوبصورت لمبے بالوں میں ہاتھی دانت کا سفید کنگھا سجائے ان کی طرف بازو پھیلائے بڑھا آرہا ہے اور پگڈنڈی کے کنکر اِدھر اُدھر گھاٹیوں میں لڑھکے جا رہے ہیں کہ اس کے نئے زریں جوتوں پر کھرونچیں نہ پڑ جائیں اور ستاروں کا ایک جھرمٹ ایک تاباں بادل کی صورت اختیار کر کے اس کے سر پر سایہ کئے تیرتا آرہا ہے۔ جھونپڑی کی دہلیز پر کھڑے کھڑے اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی آسمانی جھولے میں بیٹھی جھول رہی ہے اور جب جھولا آگے بڑھتا ہے تو آنے والا نوجوان اس کے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ وہ اس کا سفید کنگھا چرا کر اپنی زلفوں میں چھپا لیتی ہے اور جھولے کے

پیچھے ہٹتے ہی دونوں اس زور سے قہقہے لگاتے ہیں کہ ——— اور اچانک اس نے بے جانے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ اس کا باپ کھاٹ پر کروٹ بدل کر بولا۔

"اے کیا ہے آشی ——— کیوں ہنسی تو؟"

اور پھر اس کی ماں کی آواز۔

"اے ادھر آ' لیٹ جا میرے پہلو میں۔ کیوں دہلیز سے چمٹی کھڑی ہے؟" اور پھر لمبی لمبی "ہوں' ہاں" کے بعد دونوں طویل جماہیاں لیتے سو گئے۔

اس نے اپنے لمبے لمبے قدم جھونپڑی سے باہر رکھے اور بھیڑوں کے باڑے کے پاس جا کر رک گئی۔ اس کی بھوری بلی اس کے ٹخنوں سے اپنا ریشمی جسم رگڑنے لگی اور بہت دور کہیں کوئی بوڑھا کتا دو تین بار بھونک کر خاموش ہو گیا۔ بلی کو دھتکار کر وہ ہولے ہولے قدم اٹھانے لگی اور اسے ساون کے وہ دن یاد آگئے جب اس نے ایک طوفانی رات میں نازو کو اپنے جھونپڑے میں پناہ دی تھی۔

بادلوں کی گھن گرج میں جب وہ جھونپڑے کے عین درمیان ایک چولہے کے قریب بیٹھی اپنے باپ کے پاؤں داب رہی تھی تو دروازے پر تیز اور بھاری دستک ہوئی اور جب اس نے پوچھا۔

"کون؟"

تو ٹھٹھری ہوئی آواز آئی۔

"نازُو ——— نازُو ——— تارہ گاؤں والا نازو۔"

اس نے نازو کا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ کیونکہ جب نیچے وادیوں میں کبڈی کے میلے ہوتے تو آشی اپنی دوسری سہیلیوں کو ہمراہ لے کر ایک بہت اونچی چوٹی پر چٹانوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ جاتی اور نیچے چوڑے ابھرے ہوئے سینوں اور گٹھے ہوئے جسموں والے نوجوانوں کو بگولوں کی طرح دوڑتے

اور پہاڑوں کی طرح ٹکراتے دیکھتی۔ ایک بار نازو نے علاقے کے سب سے بڑے کبڈی کھیلنے والے کو یوں سر سے گھما کر پھینکا کہ وہ ڈھول پیٹنے والے کے قدموں میں آن گرا۔ اور پھر جو لوگوں نے نازو کو کاندھوں پر اٹھا کر سارے میدان کا چکر لگایا اور نیلی پیلی پگڑیاں مسرتوں کی چیخوں کے ساتھ میدان میں اچھل گئیں تو اس کے دل میں نازو سے دلچسپی سی پیدا ہو گئی!

اور پھر سرما کی اداس دوپہروں میں اور چھٹکی ہوئی بے جان چاندنی سے لپٹی ہوئی راتوں میں اس کے کنوارے جذبات پر منڈلانے والا اچانک اس کے گھروندے میں آدھمکے! ایک بار اچھل ہی تو پڑی۔ بارش کی شدت میں باہر بھیڑیں دردناک انداز میں ممیا رہی تھیں۔ آشی کے ماں باپ اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں کے تکیے بنائے نسوار کی چٹکیاں نتھنوں میں چڑھا رہے تھے اور ایک مسمسی صورت والی بلی چولہے کے کنارے اپنی دم کا آخری سرا اپنے اگلے پنجوں میں دبائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ آشی لپک کر دروازے کے قریب آئی اور زنگ خوردہ زنجیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ اپنے خیالوں کے دیوتا کو اپنے سامنے پا کر وہ کیسے ضبط کر سکے گی۔ کیا اس کا دل یونہی دھڑکتا رہے گا۔ کیا اس کی آنکھیں یونہی کھلی رہیں گی۔ کیا سرسبز وادیوں میں شیر کی طرح دھاڑتا اور بجلی کی طرح جھپٹتا ہوا نازو اس کی اس کیچڑ بھری دہلیز پر قدم دھرے گا۔ اور پھر اس نے اپنے بھدے چولہے کی طرف دیکھا۔ جس میں بجھتے ہوئے انگارے آنے والے حادثے کے انتظار میں دم سادھے زرد پڑ رہے تھے۔ اور بلی اپنی غنودگی بھری آنکھیں نیم وا کئے اپنی مونچھیں تھرتھرا رہی تھی۔ اچانک آشی کو اس کے باپ کی آواز نے دہلا دیا۔

"اری کھڑی کیا سوچ رہی ہے —— دروازہ کھول —— بے چارا باہر کھڑا ٹھٹھر رہا ہوگا۔"

اور جب آشی نے ایک کل کی طرح زنجیر کھول ڈالی اور پھوار لدے جھونکوں سے کواڑ پھٹ سے کھل گئے تو دور مشرقی افق پر چمکتی ہوئی بجلی کی چکا چوند میں اس نے ایک سروقد سایہ دیکھا جو آگے بڑھا اور آشی کے پہلو سے سمٹ کر نکلتا چولھے پر دیوانوں کی طرح جھک گیا۔ بلی ہمک کر کھاٹ پر ہو بیٹھی اور آشی کے ماں باپ نسوار کی ڈبیہ سنبھالتے اٹھے اور جب کواڑ بند کر کے آشی نازو کے بالمقابل آ کر بیٹھ گئی تو اس نے دیکھا کہ بھیگی ہوئی کالی باریک مونچھوں کے نیچے دو نیلے ہونٹ یوں کپکپا رہے تھے' جیسے آشی سے پوچھ رہے ہیں۔

"آشی اچھی تو ہو؟"

نازو کچھ دیر کے بعد سیدھا بیٹھ گیا اور بولا۔

"آج بدقسمتی سے شام کو گھاس کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ گھٹا چڑھ آئی تھی لیکن جنگل کے دراوغہ کا ڈر تھا۔ دن کو تو وہ اس پربت کا راجہ ہے۔ بھلا ہو تمہارا کہ اس ویرانے کو آباد کئے بیٹھے ہو ورنہ میں تو ٹھٹھر کر مر جاتا۔"

اور یوں ہی باتوں باتوں میں بوڑھا بڑھیا سو گئے اور بہت دیر تک نازو اور آشی سر جھکائے بیٹھے رہے۔ زرد انگاروں کی آسیبی چمک ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ باہر ہوا شوک رہی تھی اور بھیڑیں ممیا رہی تھیں۔ بلی بوڑھے کی بغل میں خرخراتی ہولے ہولے گھسی جا رہی تھی۔ اور آشی کا دل یوں دھڑک رہا تھا۔ جیسے پچھلے سال بادلوں کے جھرمٹ میں عید کے چاند کا ایک باریک تار دیکھ کر ——!

وہ گھڑی بھر انگاروں کو گھورتی نازو کے ہاتھوں کی طرف دیکھ لیتی جن کی ہتھیلیاں گلابی تھیں اور جن کا الٹا حصہ سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ ہاتھ کیسے کیسے چوڑے چکلے سینوں پر فولادی ہتھوڑے بن کر برسے ہیں۔ اور یہی

ہاتھ انگاروں پر جھکے ہوئے کیسے پیارے معلوم ہو رہے ہیں۔ آشی نے سوچا
——اور ان کے ناخن لال سیپوں کی طرح سانولے چمڑے میں کس نقاش نے
جڑے ہیں——اور لاشعوری طور پر اس سے اپنے ناخنوں کا مقابلہ کرتی رہی
اور پھر باہوں کا—— شانوں کا—— گردن کا۔ اس نے دو چار بار اپنے
شانوں اور گردن کو چھوا۔ اسی حالت میں اس کی نگاہیں نازو کی ٹھوڑی پر پڑیں
اور پھر ہونٹوں اور ناک پر سے ہوتیں اوپر اٹھ گئیں——باہر بجلی چمکی اور
کواڑ کی چولوں کے پاس دو قمقمے سے جگمگا کر بجھ گئے——نازو اس کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ ایک ساتھ دونوں کی آنکھیں جھپکیں اور پھر ایک ساتھ اٹھیں۔ اور
یونہی آنکھوں کے جھپکنے، جھکنے، اٹھنے اور مل جانے کے خاموش شور میں آشی
اپنے والدین کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھی اور بھنچی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ کبڈی کے کھلاڑی ہیں؟"

"نہیں——میں کبڈی کا کھلاڑی ہوں——" نازو نے مسکرانے
کی کوشش کرتے ہوئے کہا، اور پھر اپنے بے معنی جواب سے شرمندہ ہو کر
بولا۔ "یعنی——یعنی میں——کبڈی کا کھلاڑی ہوں۔"

—— اور اچانک ان کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کے ستارے
ٹمٹانے لگے اور ایک بار پھر کواڑ کی چولوں کے پاس دو قمقمے جگمگا کر بجھ گئے۔

"آپ اچھے کھلاڑی ہیں!" آشی نے کہا۔

اور نازو بولا۔ "نہیں میں تو بہت برا کھلاڑی ہوں۔ میں دوڑ نہیں
سکتا۔ میرا ایک گھٹنا ٹل گیا ہے اور ایک کہنی نکل گئی ہے۔ ایک پسلی بھی ایک بار
چٹخی تھی لیکن حکیم کہتے ہیں کہ پسلی کی چیخ دوسرے لوگ بھی سن لیتے ہیں۔ یہ
کوئی اور چیز چٹخی ہوگی——پھر بھی مجھے اس دن سے درد رہتا ہے کم بخت!"

"بھلا کیا چیز چٹخی ہوگی" آشی جیسے اپنے آپ سے مشورہ کر رہی تھی

——"پسلیوں سے پرے انتڑیاں ہیں اور انتڑیاں چٹخا نہیں کرتیں، کٹ جایا
کرتی ہیں، یا الجھ جایا کرتی ہیں۔ کہاں سے آئی تھی چیخ کی آواز؟"

"یہاں سے!" نازو نے بائیں جانب کی چوتھی اور پانچویں پسلی کے
درمیان اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آشی گھبرا کر ایک لکڑی سے بجھے ہوئے
انگارے الٹنے لگی۔ بلی کی خرخر بلند ہوگئی اور کواڑوں کی چولوں کے پاس دو
قمقمے جگمگا کر بجھ گئے۔ بادل اس زور سے کڑکا جیسے سیلاب کی زد میں پہاڑ بہہ
نکلے اور پتنگوں بھرا دیا اپنی زرد لو کو نچا کر دھیما ہونے لگا۔ کواڑوں پر بوندوں
کی دستک بدستور جاری رہی۔

گجردم جب آشی کے باپ نے کروٹ بدلتے ہوئے اپنی کہنی سے خرخر
کرتی بلی کا سر کچل ڈالا تو اس کی چیخوں سے تنگ آکر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور
اسے گردن سے پکڑ کر پرے پھینکتے ہوئے بولا۔

"جب دیکھو، جب ہی میری بغل میں گھسی آرہی ہے۔ کم بخت کسی
رات بغل میں بچے جن دے گی۔"

نازو مسکرایا اور آشی زور زور سے ہنسنے لگی جیسے کانسی کے کٹورے میں
یکبارگی دو چار پیسے گر پڑیں۔

بڑھیا بھی آنکھیں ملتی اٹھی جیسے کسی نے پرانے چیتھڑوں کی ایک
گٹھڑی کھول ڈالی ہے۔ نیم خوابیدہ حالت میں پکاری۔

"ہے آشو اٹھ، صبح ہوگئی۔ میرے لیے مصلے بچھا دے۔ دو سجدے کر
لوں۔"

اور پھر چولھے کے قریب آشی کا سایہ دیکھ کر بولی۔

"اری تو تو جاگ رہی ہے!"

اور سامنے نازو پر نظر ڈالی تو کھاٹ پر پہلو بدلتی کہنے لگی۔

"تُو ساری رات جاگتا رہا بچے؟ کیا کروں، نگوڑی دو ہی تو کھاٹیں ہیں ہمارے گھر میں۔ آشی میرے پاس ہی پڑ کر رات کاٹ لیتی ہے۔ میں حیران تھی کہ آج مجھے اچھے اچھے خواب کیوں دکھائی دیئے۔ ورنہ بچے جب آشی میرے پاس سوتی ہے نا تو بس ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ یوں باہیں پھیلاتی ہے اور کروٹیں بدلتی ہے کہ میں نگوڑی کھاٹ کے بازو سے ہی چمٹ کر رہ جاتی ہوں۔"

نازو ہنستا ہنستا اٹھا اور سر کے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے بولا ——"لے ماں اب میں جاتا ہوں۔ خدا تم سب کا بھلا کرے۔ آج رات اگر تم مجھے پناہ نہ دیتے تو میں ٹھنڈ سے اکڑ گیا ہوتا کسی کھوہ میں!"

اور جب نازو چلا گیا تو آشی دیر تک سوچتی رہی کہ اگر نازو واقعی آج رات کہیں کسی اندھیری گپھا میں ٹھنڈ سے اکڑ کر مرجاتا تو کیا ہوتا——کیا ہوتا ——اور وہ اسی سوچ میں غرق اٹھ کر دروازے تک آتی اور بہت دور ایک موڑ پر سفید چٹان کے پاس صبح صادق کے مٹیالے اجالے میں اسے نازو کا سایہ نظر آیا——اچانک اس کی نظروں میں ساری فضا سایوں سے بھر گئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی ایک سایہ ہے، ایک پرچھائیں، جو جہاں چاہے نکل جائے، جدھر چاہے اڑ جائے۔ چاہے زمین کے کنارے پر جاکر بیٹھ جائے، یا نیچے میدانوں میں تارہ گاؤں کے قریب منڈلاتی پھرے یا صبح کے موٹے تارے پر جا کر سو رہے——یا موڑ کے قریب نازو کے سائے میں گھل مل جائے۔ بلی اس کی ٹانگوں سے نکل کر تیر کی طرح ایک چڑیا کے پیچھے بھاگی اور آشی نے اپنا سینہ ٹٹول کر سوچا کہ جیتے جی سایہ بن جانا تو بھوت پریت کا کام ہے——میں آشی ہوں——اور وہ نازو تھا اور نازو سایہ نہیں، جیتا جاگتا جوان ہے، کبڈی کا کھلاڑی ہے اور میں آشی ہوں، ان پہاڑیوں کی چرواہی—— لیکن اس سوچ

بچار کے باوجود اسے سایوں کے خیال سے انس سا ہو گیا اور اس روز وہ صنوبروں کے سایوں اور پہاڑوں کے سایوں اور بھیڑوں کے سایوں کو بہت دیر تک دیکھتی رہی اور جب اس نے اپنا سایہ دیکھا تو اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اس کا سایہ اچانک وہاں سے اتر پڑے اور وہ دور موڑ کے پاس چوڑی سفید چٹان کے قریب سے ہوتا—— آشی کا دل دریا کی مچھلی کی طرح ایک بار اچھل کر کسی نامعلوم گہرائی میں ڈوب گیا۔ سامنے سے نازو اپنے کاندھے پر کدال رکھے جھومتا جھامتا آرہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا سایہ بھی۔

جب وہ آشی کے قریب سے گزرا تو کدال کو ایک پتھر پر ٹکا کر بولا۔

"بھیڑیں چرا رہی ہو آشی؟"

"نہیں—— میں بھیڑیں چرا رہی ہوں——" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر اپنے کہے پر لجا کر بولی—— "یعنی ——یعنی میں بھیڑیں چرا رہی ہوں۔"

نازو اور آشی کے دبے دبے قہقہے چٹانوں سے گھری ہوئی چراگاہ میں گھوم کر کہیں کھو گئے۔ اور دو ایک بھیڑیں گردنیں اٹھا کر اور زبانیں لٹکا کر ممیائیں۔ اور ایک صنوبر کی چوٹی پر سے ایک ممولا چرر چرر بولتا اڑا اور چراگاہ پر سے اڑتا ہوا موڑ کے پاس چوڑی سفید چٹان پر بیٹھ کر اپنی دم کو نچانے لگا۔ قریب ہی ایک جھاڑی سے ایک ممولن نکلی اور دو ایک بار ممولے سے پر رگڑ کر پرے سے پرے جا بیٹھی اور پھر دونوں ایک ساتھ اڑے اور یہ دو کالی گیندیں فضا میں لڑھکتی لمحہ بھر میں سائے بن کر اودے آسمان کی وسعتوں میں گھل گئیں۔

"نخریلی ممولن!" نازو نے کدال کو پتھر پر گھمایا۔

"خوشامدی ممولا۔" آشی نے بالوں کی ایک لٹ کو کان کے پیچھے جمایا۔

"چٹختی ہوئی پسلی والا ممولا۔" نازو مسکرایا۔

اور آشی نے گلابی ہونٹوں کو سکیڑ کر سر جھکا لیا۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔" نازو نے کہا اور آشی سے جواب نہ پا کر کاندھے پر کدال جمائی اور دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"جاؤں؟ ——"

"جاؤ۔" آشی بولی۔

"بادل امڈے آرہے ہیں پورب سے۔" نازو طنزاً ہنسا اور جب وہ چٹانوں کے درمیان ہرتے پھرتے رستے پر سے جھومتا ہوا گزر گیا تو آشی دیر تک ان چٹانوں پر ہاتھ پھیرتی رہی جن پر نازو کا سایہ لہراتا ہوا نکل گیا تھا۔ اس نے ایک بار محسوس کیا کہ نازو کا سایہ اس کے قابو میں آگیا ہے اور اس نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا ہے' اس کو اپنے اردگرد مضبوط گرم گرم باہیں بھی لپٹی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اچانک ایک بھیڑ زور سے ممیائی اور آشی جی ہی جی میں پچھتاتی رہی کہ اس نے نازو کو جانے ہی کیوں دیا۔ یہاں بھلا چراگاہ میں کون تھا دیکھنے والا—— "جاؤ" کا لفظ خدا جانے اس کے لبوں سے کیوں ٹپک پڑا تھا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد آشی اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ لفظ اس نے نہیں کہا' اس کے سائے نے کہا ہے اور سائے کی بات پر پچھتا کر اپنا جی برا کرنا پرلے درجے کا بچپنہ اور بھولپن ہے۔

لیکن یہ دن کی مختصر اور ادھوری ملاقاتیں جلد ہی ختم ہوگئیں اور اب راتوں کی طویل اور مکمل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نازو نیچے جھیل کے کنارے تارہ گاؤں سے لوگ سوئے نکلتا۔ ادھر آشی اپنے والدین کو سلا کر باہر آتی۔ موڑ کے پاس جھاڑی کی اوٹ میں چوڑی سفید چٹان پر گرجتی خاموشیوں اور شرماتی سرگوشیوں اور پیاسے بوسوں سے لدا پھندا وقت تھم کر بیٹھ جاتا اور جب صبح کا ستارہ اپنے پر پھڑپھڑانے لگتا اور دھندلے افق پر پو پھٹنے لگتی تو نازو

اور آشی جدا ہو جاتے اور سایوں کی طرح چٹانوں سے گھری ہوئی مہین پگڈنڈیوں پر سے گزرتے ایک دوسرے کی نظروں سے غائب ہو جاتے!

اور جب صنوبر کے لمبے لمبے سائے پہاڑوں پر اور پہاڑوں کے لمبے لمبے سائے جھیل پر بچھ جاتے تو ان وادیوں کو آنے والے کیف بھرے حادثات کا انتظار قیامت خیز دھڑکنوں سے لبریز کر دیتا۔ سورج ڈوبتا تو انہیں اس شدت کا بخار چڑھتا' جیسے ان کے وجود کی تپش سے کائنات جھلس جائے گی۔

اور آج رات اتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر آشی نے پھر اسی چٹان کا رخ کیا جس کی سنگین سطح پر گزرے ہوئے رنگین لمحوں کی ایک سیج سی بچھی رہتی تھی۔ آشی آج وقت سے پہلے اس چٹان کے پاس پہنچی اور اس پر دیر تک ہاتھ پھیرتی رہی۔ پیلا چاند دور مغربی پربت کی چوٹی پر ایک اونچے صنوبر کی آخری پھننگ پر ٹھوڑی رکھے جیسے سونے کی کوشش میں مصروف تھا' اور ساری فضا دھندلے سایوں کا ایک ہجوم معلوم ہوتی تھی۔ اچانک آشی کے پاؤں کے تلوے دہک سے اٹھے اور سینہ یوں پھڑکنے لگا' جیسے جھیل کی سطح پر ابھرے ہوئے کنول کی پنکھڑیاں اکا دکا بوندوں سے تھرتھرا اٹھتی ہیں! اسے قدموں کی چاپ سنائی دی—— لیکن ایکا ایکی وہ لپک کر چٹان کے قریب جھاڑی میں دبک گئی اور مولا اور مولن پھڑپھڑا کر مخالف سمتوں میں اڑ گئے۔ آشی کو آج خلاف معمول دو کی بجائے چار قدموں کی چاپ سنائی دی تھی——!

"کوئی مسافر ہوں گے!" اس نے سوچا۔ "اور میرا نازو انہی کے پیچھے آرہا ہوگا۔ اسی لیے تو آج اتنی دیر تک یہ چٹان ویران پڑی ہے۔"

موڑ پر دو سائے نمودار ہوئے اور چٹان کے قریب آکر رک گئے۔

ایک بولا۔

"ابھی تک نہیں آئی۔ ہم سویرے پہنچے ہیں۔ میں اسے جھونپڑی سے

بلائے لاتا ہوں۔ خدا کی قسم، بابو جی! آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو اپنے شہر کی کنواریوں کو بھول جائیں۔ بس یوں سمجھئے کہ آشی لڑکی نہیں، شراب کا ایک خواب آور گھونٹ ہے۔ اس شراب میں کوئی تلخی نہیں، اس کے قطرے قطرے میں مٹھاس کے چشمے رواں ہیں۔"

اور دوسرا سایہ بولا۔

"لیکن نازو! مجھ سے کترائے گی وہ۔"

نازو ہنس کر کہنے لگا۔

"وہ تو موم کا کھلونا ہے جی! وہ تو چینی کی گڑیا ہے۔ آپ اٹھا لیں تو آپ کی، میں اٹھا لوں تو میری۔ بہت ہی بھولی۔ بابو جی! بس اس کی مٹھی میں ایک روپیہ تھما دیجئے۔ وہ آپ سے یوں چمٹے گی کہ سورج کی پہلی کرن ہی اسے جدا کر سکے گی۔ میں آپ کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ وہ پالتو کتیا کی طرح میرے بس میں ہے۔ نہ جانے کہاں رہ گئی۔ بس وہ آہی رہی ہوگی۔ آپ ساری عمر یاد رکھیں گے کہ نازو نے دس روپے تو لیے لیکن جوانی کی شراب کا ایک ایسا گھونٹ پلایا کہ آپ کو لاہور شہر میں ساری عمر بیٹھنے سے بھی نہ مل سکے۔ لیجئے بیٹھ جائیے یہاں چٹان پر!"

اور جب نازو آشی کے جھونپڑے کی طرف بڑھا اور بابو جی چٹان پر بیٹھ گئے تو آشی نے محسوس کیا کہ اس سنگین سطح پر گزرے ہوئے رنگین لمحے اچانک کملا گئے ہیں اور ——— اور یہ سایوں سے بھری رات اپنے ہونٹ کچکچاتی اسے نگلے جا رہی ہے۔

بجلی کی طرح کوئی احساس اس کے رگ و پے میں لہرا گیا اور جب نازو بیس تیس قدم دور نکل گیا تو وہ جھاڑی کی اوٹ سے ہٹ کر بابو جی کے سامنے آگئی۔

"میں آشی ہوں۔" وہ بولی ——— "جس کے لیے آپ کا دوست آپ کو یہاں لے آیا۔ آپ اس کے آنے سے پہلے ہی مجھے اپنا بنا لیجئے۔ میں اس کم بخت سے نفرت کرتی ہوں۔ کبھی ایک کوڑی تک اس نے میری ہتھیلی پر نہیں رکھی ——— موا کنگلا! آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ آیئے، آیئے نا، مجھے چوم لیجئے۔ مجھے اپنی گود میں ڈال لیجئے۔ مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیجئے۔ بابو جی! آشی آپ کی ہے۔ کیا آپ مجھے لاہور لے جائیں گے!"

اور جب کافی دیر کے بعد دور سے نازو کا سایہ واپس آتا نظر آیا تو آشی بابو جی سے الگ ہو گئی اور موڑ کے پیچھے چھپ گئی۔

نازو بابو جی کے قریب آیا تو مایوسانہ انداز میں بولا۔

"خدا جانے کدھر گئی کم بخت، جھونپڑے میں بھی نہیں۔ اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا مگر اس کا سایہ تک کہیں نظر نہ آیا۔"

آشی موڑ کی اوٹ سے نکل کر نازو کے سامنے آگئی۔ چاند بھی صنوبر کی ڈالی کی اوٹ سے نکل آیا۔

نازو دم بخود رہ گیا اور آشی بولی۔

"تم مجھے کہاں ڈھونڈتے پھرے۔ یہی چٹان تو میری دنیا ہے۔ پالتو کتیا اتنی گئی گزری نہیں ہوتی کہ اپنے مالک سے چھپ کر کہیں نکل جائے۔ میں نے تمہارے دوست کو انتظار کی تکلیف سے بچا لیا۔ میں نے ان کی تسلی کر دی ہے اور تم ——— میرے پیارے نازو ——— میں تمہاری تسلی بھی کر دوں!"

اور اچانک آشی نے اپنے کپڑے ایک جھٹکے سے پھاڑ کر الگ پھینک دیئے۔ اور چیخ کر بولی۔

"تمہیں میرا جسم چاہیئے نا ——— لو دیکھ لو میرا جسم۔ یہ میری پنڈلیاں، یہ میرے کولھے، یہ رخسار، یہ ہونٹ ——— لو دیکھو ——— جی بھر کر دیکھو کہ پھر

تمہیں کسی اور لڑکی کو دیکھنے کی ہوس نہ رہے، لو—— گھور گھور کر دیکھو اور اپنی آنکھوں کو سینکو کہ آشی بہت بھولی ہے۔—— پالتو کتیا کی طرح بھولی اور نادان۔"

"آشی!" نازو پکارا—— اور قبل اس کے کہ وہ اسے چھو سکتا، آشی اندھیری گھاٹی میں کود گئی۔ لہراتے ہوئے بالوں اور پھیلی ہوئی بانہوں والا ایک سایہ گھاٹی کی گہرائیوں کی طرف لپکا۔ دھپ کی آواز کے ساتھ دو چار پتھر نیچے لڑھک کر ایک خاموش جھرنے میں جا گرے اور جھرنے کی سطح پر سویا ہوا چاند کا سایہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہت دیر تک تڑپتا رہا۔

حد فاصل

پڑوسن کو چھیڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، اور پھر جس پڑوسن کے دانت سونے کے تاروں میں جکڑے ہوئے ہوں، اور جس کے لمبے چوڑے دوپٹے پر ستارے ہی ستارے ٹکے ہوں، اسے چھیڑنا تو بھڑوں کے چھتے کو چومنا ہے۔ مسعود پڑوسنوں کے معاملے میں بہت محتاج واقع ہوا تھا۔ کیونکہ چند ہفتے قبل اس کے ایک دوست نے پڑوس کی ایک لڑکی پر رات کے اندھیرے میں کاغذ کے گولے پھینکے تھے اور جب لڑکی کے چیخنے چلانے پر محلے کا محلّہ اکٹھا ہو گیا تو اس کے دوست نے غضب ناک انبوہ کے سامنے گڑگڑا کر معافی مانگی تھی اور کہا تھا،

"اب سے وہ میری اماں۔"

اس قسم کی صورت حالات کا پیدا ہو جانا مسعود کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے جب وہ نئے مکان میں آیا اور سب سے اول گرد و پیش کا جائزہ لیا اور جب ساتھ کے فلیٹ سے چوڑیوں کا ایک تیز چھناکا سنا تو مکان کی چھت پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور بڑے کمرے کو نئے نئے زاویوں سے پرکھنے لگا۔

لیکن گرمیوں کا موسم قریب تھا اور رات کو صرف چھت پر ہی سویا جا سکتا تھا۔ صحن تنگ تھا اور تاریک، پیپل کے ایک بڑے ٹہنے نے جھک کر اس تاریکی میں مسلسل سرسراہٹ بھی گھول رکھی تھی۔ اور پھر گرمیوں میں رات کو

پیپل کی چھاؤں تلے سونا تو ایسا ہی ہے، جیسے گنجے سر پر گھی لگا کر بجلی کی روشنی
کے نیچے کھڑے ہو جانا۔

دبے پاؤں وہ چھت پر گیا۔

پڑوس کی چھت ایک پست سی دیوار کے ذریعے الگ کر دی گئی تھی
اس لیے وہ اطمینان سے ایک مرتبہ چھت کے پرلے سرے تک ہو آیا جہاں
سے بہت نیچے کھلی سڑک کا منظر دلاویز تھا۔ اور پھر سڑک کے اس پار مسعود کے
فلیٹ کے بالکل مقابل ایک بنگلہ تھا جس کے برآمدے میں بہت سی بلوریں
پنڈلیاں کرسیوں سے لٹک رہی تھیں۔ پنڈلیوں سے اوپر کا حصہ ایک تنے اور
کھچے ہوئے بہت لمبے ٹاٹ نے اوجھل کر رکھا تھا۔ وہ اس ٹاٹ کی بیہودگی کی
تاویل سوچ رہا تھا کہ حد فاصل کے قریب ہی سے آواز آئی۔

"نگوڑا بیوی نہ لایا تو نکلوا دیں گے!"

یہ بالکل الگ بات تھی کہ مالک مکان عرصہ سے تجرد کی زندگی بسر کر رہا
تھا۔ لیکن مجرد کرایہ دار کا بال بچوں والے گھر کے پڑوس میں آبسنا شاید اسے بھی
گوارا نہ تھا۔ اور اس نے مسعود کو متنبہ کر دیا تھا۔

"مگر حضرت! یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ آپ کے دوست کی سفارش سے
مجبور ہوں، ورنہ کنواروں کو مکان دینے سے میں ہمیشہ ہچکچاتا رہا ہوں ابھی ایک
سال بھی نہیں گزرا۔ برما کی ایک کنواری لڑکی ایک فلیٹ میں آکر رہی۔ نہ
جانے دن بھر کہاں کام کرتی تھی۔ بہرحال کرایہ ہر مہینے ادا کر دیتی تھی۔ آٹھ نو
مہینے کے بعد اس کے ہاں ـــــ" اور اس نے مسکرا کر کان میں پھنگیا ڈال
دی۔ "میرا مطلب ہے ذرا ہوشیار رہئے گا۔"

آسمان بالکل صاف تھا۔ چیلوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں پتنگ بھی اڑ
رہے تھے، اور ان پتنگوں کے اوپر سے زرد رنگ کا ایک طیارہ گرجتا ہوا گزر رہا

تھا۔ معاً" حد فاصل کے اس طرف سے ایک بچے کی آواز آئی۔

"امی! یہ انگریزی جہاز ہے نا؟"

"نہیں چینی ہے!" ـــــ اور چوڑیاں چینی کی پلیٹوں کی طرح
بجیں۔

بچے نے پوچھا۔

"ہندوستانی کیوں نہیں؟"

جواب ملا۔

"ہندوستانی ڈرپوک ہوتے ہیں ـــــ" اور چوڑیوں کے چھناکے اور
انگڑائی کی ایک مبہم "ہائے" کے ساتھ دیوار کے قریب ہی ایک سر ابھرا، اور
ڈرپوک ہندوستانی دبک گیا۔

چھت پر خاموشی چھا گئی تھی۔

مگر وہ دیر تک وہیں دبکا بیٹھا رہا۔

زرد رنگ کا ہوائی جہاز ہوا میں پلٹے کھاتا اچانک سنبھلا اور اس کے سر
پر سے چھلاوے کی طرح گزر گیا۔ پیپل پر بیٹھے ہوئے پرندے پتوں کی طرح ہوا
میں بکھر گئے ـــــ مسعود نے نئے مکان کے بارے میں جن ارادوں اور امنگوں
کو اپنے تصور میں پال رکھا تھا، وہ ان پرندوں سے کتنے مشابہ تھے۔ اس نے
سوچ رکھا تھا کہ مکان کی سفیدی ہو گئی تو نیلام منڈی سے خریدا ہوا صوفہ سیٹ
زاویہ منفرجہ کی صورت میں رکھا جائے گا ـــــ اور پھر نئی دری اور ایرانی
قالینچہ اور شیشے کی الماری میں سجی ہوئی اردو انگریزی کی نئی نئی کتابیں، اوپر
چھت پر ایک پلنگ، ایک میز اور دو کرسیاں ہر وقت پڑی رہیں گی۔ سردیوں میں
دن کو اور گرمیوں میں رات کو چھت پر وہ اپنے احباب کے ساتھ گپیں اڑائے
گا۔ اور پھر ریڈیو سیٹ اور گراموفون اور وائلن ـــــ اور نہ جانے کیا کیا۔ ان

سب چیزوں کے علاوہ وہ ایک عدد بیوی حاصل کرنے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔ اور والدین کو مطلع کر دیا تھا کہ ٹٹول جاری رکھئے۔ میں ادھر کچھ رقم جمع کرتا ہوں' آپ ادھر کوئی فیصلہ کیجئے۔ لڑکی کے متعلق اس نے صرف یہی لکھا تھا کہ کوئی سگھڑ سیانی سلیقہ شعار لڑکی ہو' بہت پڑھی لکھی نہ ہو۔ کیونکہ ایک بیوی کے لیے اقبال کے فلسفہ خودی کی بجائے چولھے میں وقت پر لکڑی ڈالنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

لیکن یہاں تو چھت کے ساتھ ہی دوسری چھت تھی' اور دوسری کے ساتھ تیسری اور پھر چوتھی وعلیٰ ہذا ——— اور پھر پست سی حد فاصل۔ ہر طرف ننھے ننھے بچوں کی روں راں' بوڑھیوں کی کھانسیاں' برتنوں کی ٹھناٹھن' یہاں تو اونچا قہقہہ لگا نہیں' اور پڑوسنوں کی آبرو پر بنی نہیں۔ مگر آخر وہ اور کہیں جاتا بھی تو کہاں۔ جنگ کا زمانہ اور لاہور کا شہر! مکانوں کی اتنی افراط کہاں کہ اچھے برے کا امتیاز ممکن ہوتا۔ یہ مکان بھی تو اسے قدرت کی ایک ستم ظریفی نے بخشا تھا۔ اس کے ایک دوست یہاں ایک میڈیکل لائن میں ملازم تھے۔ بیوی پیٹ سے تھیں' انہیں ہسپتال میں داخل کرایا۔ دو تین روز ہوٹل سے کھانا کھایا تو ان کے اپنے پیٹ میں کچھ گڑبڑ شروع ہو گئی۔ اس لیے مالک مکان سے مسعود کی سفارش کرتے بیوی اور بچے کو ہمراہ لیتے تبدیلی آب و ہوا کے لیے بہاولپور چلے گئے۔

بہت دیر کے بعد وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔

ساتھ کی چھت پر بالکل خاموشی تھی اور زرد ہوائی جہاز کہیں دور بڑبڑا رہا تھا۔ پرندے پیپل پر جمع ہو گئے تھے۔ مسعود نے بھی تمام افکار کو ایک مرکز پر سمیٹ لیا' اور جب پورے اطمینان سے اٹھا تو اپنے بالکل مقابل اسے ایک خاتون کا چہرہ نظر آیا جو "اوئی" کر کے پیچھے ہٹی۔ چوڑیاں چھنکاتی سلیپر گھسیٹتی

سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ اور موئے مشٹنڈے اور لچے شہدے سے لے کر اس مقام تک مسعود کی قصیدہ خوانی کی' جسے عرف عام میں ساتویں پشت کہتے ہیں۔

معاملہ نئے نئے پڑوس کا تھا ورنہ مسعود کے پاس بھی مشٹنڈے اور شہدے کے مقابلہ میں گرجتے گونجتے الفاظ کا ایک ذخیرہ جمع تھا' جو کنوارے ساتھیوں کی طویل شبانہ صحبتوں کا ایک عالمگیر تحفہ ہے۔ حد فاصل کے آخری سرے پر چار آنکھوں کی مڈبھیڑ مسعود کے دماغ پر پہلے پہل ایک اچانک حادثہ کی طرح اثر انداز ہوئی۔ اور وہ کچھ دیر تک ہکا بکا کھڑا بہت پرے کے فلیٹ کی چھت پر ایک بوڑھے کو دیکھتا رہا' جو اینٹوں کے ٹکڑوں سے حد فاصل کو بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مسعود نہایت احتیاط سے سرک کر نیچے آیا' اس کا ملازم باورچی خانہ کی سامنے والی دیوار پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر کے اوپر کوئلے سے خوش آمدید لکھ رہا تھا۔ مسعود نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"سلطان! ارے بھئی سوئیں گے کہاں؟"

ایکٹرس کی تصویر اور خوش آمدید کی جنت سے اچانک باہر گھسیٹے جانے پر وہ بوکھلا سا گیا اور نہایت بھدے انداز میں ہنس کر بولا۔

"لنڈے بازار سے؟"

اس کی گھبراہٹ اور بڑھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہ فوٹو خریدی تھی!" وہ پیلے دانتوں کو بھورے مسوڑوں سمیت دکھا کر بولا۔

مسعود مسکرایا' اس لالٹین کی طرح جس کا شیشہ دھوئیں سے سیاہ ہو چکا ہو۔ اس نے کہا۔

"ار بھئی! میں نے تو تصویر کی کوئی بات نہیں کی۔ میں تو پوچھ رہا تھا کہ آخر ہم رات کو سوئیں گے کہاں؟"

"بولا ——— "اوپر"

اس نے کہا۔ "مگر اوپر تو ———"

"اوپر کیا؟"

"بھئی اوپر اچھی جگہ نہیں ہے۔"

"اچھا جی!" اس نے تعجب سے کہا اور "گوری چھت پر بیٹھی نہائے" گاتا اوپر چلا گیا۔

مسعود کمرے میں آکر ایک گرد آلود کرسی پر بیٹھ گیا' اور کھڑکی سے مقابل کی کوٹھی کو دیکھنے لگا۔ گوری پنڈلیاں ٹاٹ کے پردے کے نیچے اسی طرح لٹک رہی تھیں۔ اور باہر پلاٹ میں ایک ہندوستانی بیرا پگڑی پر پیتل کا ایک بلّہ لگائے ایک سفید کتے کو کھلا رہا تھا۔

سلطان دبے پاؤں اس کے قریب آیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور لذت کی چمک پیدا ہو رہی تھی۔ سرگوشی میں بولا۔

"بابو جی ——— سنئے گا۔"

"کیا سنو؟" وہ ذرا آگے جھک گیا۔

"پڑوس میں گانا ہو رہا ہے۔"

"گانا ہو رہا ہے؟"

اس نے کان لگا کر سنا تو۔

"گوری چھت پر بیٹھی نہائے"

کی باریک تانیں حد فاصل سے اچھل اچھل کر اس کے فلیٹ کے صحن میں برس رہی تھیں۔

"کون گا رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اجی گا رہی ہے کہئے ——— سنئے گا۔" اس نے ایک آنکھ میچ لی۔

آواز آئی۔

گوری چودہ برس کی چھوری
گوری پریت کرئے جورا جوری
گوری موتی دلوں کے چرائے
گوری چھت پر بیٹھی نہائے

مسعود نے کہا۔ "کون ہے؟"

اس نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت کو ملا کر ہاتھ کو تھرتھرایا۔ اور بولا۔

"سانولا سلونا من بھائے رے۔"

مسعود نے کہا۔ "بکواس بند کرو۔"

اس کے اچانک بگڑنے پر وہ ٹھٹھک سا گیا۔ اور ایک دیگچی اٹھا کر نلکے کے پاس جا بیٹھا۔

آواز مسلسل آتی رہی۔

سلطان دیگچی کو رگڑتا رہا۔

اور سنہری دانتوں والی پڑوسن کے تصور اور سانوے سلونے کے پر معنی اشارے میں تصادم ہوتا رہا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ غضب ناک پڑوسن کا رنگ ضرورت سے زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ اور سانولے سلونے کے الفاظ سن کو تو ایک ایسا چہرہ سامنے آجاتا ہے جس پر پھیکی سی' اڑی اڑی سی سیاہی چھائی رہتی ہے' آخر سلطان نے کسے دیکھا تھا۔ اور یہ شریر گیت گانے والی کون ہے' جس کی آواز میں نئے ریکارڈ کا کرارہ پن اور تازہ پھول کی شگفتگی ہے۔

نئے مکان کے سلسلے میں اسے بہت سے ضروری کام کرنے تھے۔ مگر اس الجھن نے اسے جکڑ سا رکھا تھا۔ گیت ختم ہوا تو اس نے ایک اور رخ پر سوچنا شروع کیا۔

"اگر پڑوسن میرے سامنے آجانے سے اس درجہ برافروختہ ہوئی ہیں، تو آخر ان کے غصے کی مدت کچھ طویل ہونی چاہیئے تھی، انہوں نے یہ کیسے برداشت کر لیا، کہ ان کی کوئی بہن یا لڑکی یا کوئی اور عزیزہ گیت گائے، اور وہ بھی چھت پر گوری کے نہانے کا گیت——"

بہت کچھ سوچ بچار کے باوجود اس نے محض اپنے ذہنی سکون کے لیے یہی نتیجہ نکالا کہ عورت مکڑی کے جالے کی طرح نازک اور پراسرار چیز ہے۔ وہ آندھیوں کے تھپیڑوں میں بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے، مگر ایک انگلی کے ذرا سے مس سے اپنی جگہ سے اکھڑ بھی سکتی ہے۔ عورت کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرنا، تار عنکبوت کا کیمیاوی تجزیہ کرنا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو دھند کے باریک ملائم تاروں پر لپٹتے دیکھا تو پکار اٹھا۔

"سلطان۔"

وہ وہیں سے بولا۔ "حضور!"

مسعود نے کہا۔ "بات سنو۔"

سلطان قریب آکر بولا۔ "جی فرمایئے!"

"ناراض ہوگئے؟" اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک مطلبی سی مسکراہٹ ابھاری۔ سلطان کی سنجیدگی بلبلے کی طرح ناپید ہوگئی۔ پیلے دانتوں کو بھورے مسوڑوں سمیت دکھا کر بولا۔

"آپ بھی خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ!"

وہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔

"دیگچی دھولی؟"

"جی دھوئی رکھی تھی پہلے سے، میں نے بس آپ کے ڈر سے۔"

مسعود ہنسا، جیسے لٹھا پھٹتا ہے، ایک عجیب سی لذت آمیز مگر تکلیف دہ الجھن کے دوران میں ہنسنا جنازے پر انار چھوڑنا ہے، اس کی اس بے ہنگم ہنسی نے سلطان کو چونکا سا دیا——بولا۔ "آپ——"

مسعود نے کہا۔ "کوئی اور بات کرو!"

"اور بات؟"

"ہاں ہاں! سانولے سلونے ہی کا قصہ سنا دو!"

"اجی حضور!" وہ قہقہہ مار کر ہنسا "کورا گھڑا کبھی دیکھا ہے آپ نے؟"

"ہاں!"

"اسے کبھی بجایا بھی ہے؟"

"ہاں ہاں۔"

"تو بس کورا گھڑا سمجھئے اسے۔ بھری بھری، جیسے ابھی چھلکی کہ چھلکی، گول مٹول سی، لکھنؤ کی ککڑیوں کی طرح۔"

"اور آواز تو سچ مچ کورے گھڑے کی سی ہے۔"

"یہ تو حضور دور کی بات ہے نا، پاس سے سنیئے تو بات ہی اور ہے۔ ہر تان میں چھری ہے۔"

"ناک نقشہ؟——"

"وہ تو حضور رنگ کی بپتا پڑ گئی، ورنہ یہ یہ آنکھیں، اور اتنے اتنے بال اور منہ—— جیسے کسی نے نشتر سے ذرا سا چیر دیا ہے، آپ تو جہاں بھی گئے، ویرانے میں مکان لیا۔ رات کو آنکھ کھلی تو الو میاں پکار اٹھے، اور دن کو

دھوپ اور آندھی اور گرد و غبار——وہ آپ کو یاد ہے نا پورن——وہ جو چھت لیپنے آئی تھی۔ اس روز شام کو میں نے چاول پکائے تھے۔ صرف اس لیے کہ اسے——"

"میں سمجھ گیا۔ تم بہت لمبا قصہ لے بیٹھے۔ اچھا تو کورے گھڑے کی بات کر رہے تھے تم!"

"جی ہاں!" وہ بولا۔ "یعنی ایسا لگتا ہے جیسے کمہار نے بھی نہیں چھُوا' کہیں اوپر سے فرشتے اتار لائے ہیں۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پڑوس تو چٹ پٹا ملا۔ آپ کا جی بھی بہلا رہے گا۔"

"چل ہٹ!" مسعود نے مصنوعی غصے سے کہا۔

مگر وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا اور دھیمے دھیمے گنگناتا ہوا باورچی خانہ کی طرف چل دیا۔

"گوری——ہائے ری گوری——چھت پر بیٹھی نہائے۔"

لیکن مسعود چھت پر ٹھیک اس وقت گیا جب سورج غروب کی حد سے بھی کہیں نیچے جا چکا تھا۔ حد فاصل کے اس طرف بچے کے ہنسنے رونے کے سوا کوئی بلند آواز سنائی نہ دی۔ البتہ ایک مرتبہ ایک طویل "ہائے" کی آواز سے وہ چونکا۔ تکیے سے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ کہنی کے بل ہو بیٹھا' لیکن جب کچھ پلے نہ پڑا تو سو گیا۔

اسے بڑے مزے کی نیند آئی۔ تمام رات کٹورے سے بجتے رہے' اور گیت سے سرسراتے رہے۔ صبح آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ اور نیچے سڑک پر ٹریفک کے شور نے محاذ جنگ کا سماں باندھ رکھا تھا۔

چند روز اس نے بہت احتیاط سے کام لیا۔ لیکن جب احتیاط ضرورت سے زیادہ ہو تو بے احتیاطی لازمی ہے۔ سلطان بازار میں سودا لینے گیا تھا اور وہ

باہر دالان میں بیٹھا پیپل کے پتوں کی کروٹیں اور کپکپاہٹیں دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے کہا۔ "دروازہ کھلا ہے!"

"بی بی جی نے یہ چاول بھیجے ہیں!" آواز آئی۔

مسعود نے پلٹ کر دیکھا' تو ایک سانولی سلونی گول مٹول سی لڑکی ہاتھ میں چاولوں سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھائے نظریں جھکائے کھڑی تھی' چند روز کی ذہنی کوفت نے اس کے دماغ پر جو بوجھ سا ڈال رکھا تھا' ہٹ گیا۔

"اچھا تو یہ ہے وہ پیاری پیاری آواز والی سانولی سلونی چھوری۔" اس نے سوچا اور پوچھا۔

"کون سی بی بی جی نے؟"

"یہ ساتھ والی ہیں نا——" وہ بولی۔ "انہوں نے کہا ہے یہ چاول بابو جی کو دے آؤ——"

"اندر رکھ دو' کونے والی میز پر" مسعود نے بے پروائی سے کہا۔

"اور میری طرف سے بی بی کا شکریہ ادا کر دو۔"

"جی اچھا۔" اور وہ اپنے آپ کو دوپٹے میں جکڑتی چلی گئی۔

باہر ایک ہوائی جہاز بڑبڑا رہا تھا۔ موجودہ دور میں نت نئے طیاروں کو دیکھنے کے باوجود ہم ہندوستانیوں کی حیرت میں کمی نہیں آئی۔ ادھر سر پر سے طیارہ گزرا' ادھر بڑے بڑوں کی آنکھیں آسمان پر لگ گئیں۔

"یہ جا رہا ہے' وہ جا رہا ہے' وہ مڑ رہا ہے' وہ غوطہ لگا گیا' وہ ابھرا۔ چینی ہے' نہیں امریکی ہے' بمبار ہے' نہیں نہیں' دیکھ بھال کرنے والا ہلکا طیارہ ہے۔ اسے رہنے بھی دے' تجھے کیا معلوم' اور تجھے سب کچھ معلوم ہے' جیسے تمہارا باپ ایئر کمانڈر رہ چکا ہے' ہیں؟" ہائے ہم بے بسوں کی بے ضرر دشمنیاں اور معصوم مخالفتیں۔ جن کی تہ میں اجنبیت کا احساس ہے۔ اجنبیت کا

احساس، تعجب اور حیرت کا منبع ہے اور حیرت میں کرید ہے، تلاش ہے، جذبۂ حصول ہے۔

مسعود لپک کر دالان میں آگیا۔

طیارہ بڑبڑا رہا تھا۔

مگر پیپل کے گھنے ٹہنے نے چھتری سی تان رکھی تھی۔ سٹ پٹا کر مسعود نے آسمان کے اس حصے کی طرف دیکھا جو چھت اور پیپل کے درمیان حائل تھا۔ لیکن وہاں طیارے کی بجائے اسے وہی سانولی چھوکری نظر آئی، جو منہ کھولے آسمان کو گھور رہی تھی، گردن کے الٹے جھکاؤ سے اس کے جسم میں کمان کا سا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

اجنبیت، حیرت اور کرید ——! مسعود کرسی پر بیٹھ کر ہوائی جہاز کے بہانے اسی کو دیکھنے لگا۔ اور وہ بھی ہوائی جہاز کے بجائے آسمان کے کسی اور نقطے پر نظریں جمائے رہی۔ کیونکہ ہوائی جہاز جا چکا تھا، اور پیپل کے ٹہنے پر پرندوں نے چیخم دھاڑ مچا رکھی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے دالان میں جھانکا۔ پلٹنے لگی تو مسعود نے کہا۔

"پلیٹ لے جاؤ بی بی!"

وہ کچھ جواب دیئے بغیر پرے ہٹ گئی، تو مسعود نے چاولوں کو ایک اور پلیٹ میں ڈالا۔ اور دالان کے بڑے دروازے سے ملحقہ کواڑ پر ہلکی سی دستک دے دی۔

"کون؟" اندر سے آواز آئی۔

"پلیٹ!" اس نے کہا۔

سانولی لڑکی نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا تو پرلی طرف مسعود کو رکی رکی دبی دبی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"اتنی بھی کیا جلدی تھی؟" سانولی لڑکی جیسے رٹا ہوا فقرہ دہرا رہی ہے۔

مسعود بولا۔ "بال بچوں کا گھر ہوا۔ کیا خبر کیا ضرورت پڑ جائے اس کی" اور اپنے فلیٹ میں آگیا۔

سلطان اس کا پرانا ملازم تھا، اس لیے اس سے انس بھی تھا۔ لیکن اس نئے سفر میں اسے تنہائی کی آرزو تھی۔ بڑے کمرے میں ایک کرسی پر لیٹ کر وہ بہت دیر تک آنے والے دنوں کے دلاویز نقوش ابھارتا رہا، لیکن سلطان کا وجود ان نقوش کو پوری شدت اور رعنائی سے ابھرنے نہیں دیتا تھا۔ اور آخر جب سلطان بازار سے واپس آیا تو مسعود نے کہا۔

"سلطان! کیا حال ہے تمہاری ماں کا —— پھر بھی کوئی خط آیا ہے گھر سے؟"

وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔ "حضور پہلے تو مکان کی مشکل تھی۔ اب وہ مشکل دور ہوئی ہے تو مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیجئے، ماں ابھی تک بیمار ہے۔ میں ایک مہینے تک ضرور واپس آجاؤں گا۔ میں خود بھی آج آپ سے عرض کرنے والا تھا۔"

مسعود نے التجا کی منظوری کو منطقی طول دینا چاہا۔

"مگر سلطان، مجھے کھانے کی تکلیف ہوگی۔"

وہ اس کے قریب بیٹھ کر لجاجت سے بولا۔

"ہمارے مکان کے بالکل نیچے اچھا بھلا ہوٹل ہے، اور پھر حضور میں تو ایک مہینے سے بھی پہلے آنے کی کوشش کروں گا۔"

مسعود نے اسے اجازت دے دی، اور وہ سفر کی تیاریوں میں اتنا محو ہوا کہ پڑوس کا گرما گرم موضوع تک نہ چھیڑا۔ عصر کی گاڑی سے وہ اپنے گاؤں

کو روانہ ہو گیا۔

اب میدان صاف تھا۔

لیکن!

صاف میدان میں راستہ معین نہ ہو، تو بھٹکنا یقینی ہے۔

گہری سوچ بچار کے بعد مسعود نے یہی فیصلہ کیا کہ کھیل کھیلو، دنیا فانی ہے۔ جوانی ہمیشہ نہیں رہتی، اور سلطان کی آمد کا کوئی اعتبار نہیں۔ شام تک وہ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر گونجتی ہوئی سڑک کو دیکھتا رہا، جس پر سے لوگ پاگلوں کی طرح گزر رہے تھے۔ موٹروں، تانگوں اور سائیکلوں کے قافلے دندناتے ہوئے آتے اور نکل جاتے۔ موٹے موٹے سیٹھ اپنی بیویوں، بیٹیوں کو بنا سنوار کر ایک طرف سے نمودار ہوتے اور ہنستے کھلکھلاتے دوسرے موڑ پر غائب ہو جاتے۔ غریب پوربئے ککڑیوں کے بچے ہوئے چھلکوں کو نوچتے، پلپلے آم چوستے اور گندے ہاتھوں کو دھوتیوں سے پونچھتے سڑک کے کنارے کنارے رینگتے دور نکل جاتے، ایک چکر جاری تھا ازلی و ابدی، جس کا ٹھہراؤ ممکن نہ تھا۔

پرلی طرف کوٹھی کے برآمدے میں ٹاٹ کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ لیکن گوری پنڈلیاں بھی غائب تھیں، سفید پگڑی والا بیرا اپنی پگڑی اتار کر پیتل کے بلے کو رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔

زندگی پوری تیزی سے رواں دواں تھی۔

اور مسعود کھڑکی کے پاس بیٹھا اپنے تپتے اور دہکتے ہوئے دماغ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سوچ رہا تھا کہ جب ہر چیز میں حرکت ہے، زاویئے بدل رہے ہیں، چھاؤں ڈھل رہی ہے۔ سورج دور شیشم کے درختوں کی اوٹ میں مغرب کے دھواں دھار پھیلاؤ کی طرف پھسلا جا رہا ہے۔ ٹاٹ اتر چکا ہے۔ پوربئے دن بھر کی مزدوری کے بعد واپس آ گئے ہیں۔ ہوٹل والا حقے کو چھوڑ کر

شامی کبابوں کی ٹکیاں بنا رہا ہے۔ تو اس کا یوں جم کر بیٹھے رہنا یقیناً اس کی بزدلی اور کم حوصلگی کی دلیل ہے۔ وہ بھڑک کر اٹھا اور سیڑھیوں پر دھک دھک پاؤں مارتا چھت پر آ گیا۔ ساتھ کے فلیٹ میں ایک بچہ رو رہا تھا اور بہت پرے ایک بوڑھا پست دیوار پر مزید اینٹیں جما رہا تھا۔ وہ چھت پر ٹہلتے "گوری چھت پر بیٹھی نہائے" گنگنانے لگا۔ پیپل کی ٹہنوں پر چڑیوں کے غولوں نے شور مچا رکھا تھا۔ اس لیے شاید اس کی گنگناہٹ پڑوس کے صحن پر نہ برس سکی۔ گنگناہٹ سے اگلا درجہ بلبلاہٹ کا ہے، لیکن اپنے آپ میں اتنا حوصلہ نہ پا کر وہ نیچے اتر آیا۔ ابھی کھڑکی کے پاس گیا تھا کہ دالان کا دروازہ ہولے سے کھلا، اور سانولی لڑکی دوپٹے میں کوئی چیز چھپائے اندر آ گئی۔

"کہاں رکھوں؟" اس نے پوچھا۔

"کیا ہے؟" وہ بولا۔

"حلوا" وہ مسکرائی۔

"کس نے بھیجا ہے؟"

"میں لائی ہوں!"

"لیکن بھیجا کس نے ہے؟"

اس نے پلیٹ کو میز پر رکھ دیا اور بولی۔ "آپ کو کھانے سے غرض ہے، پوچھ کر کیا کریں گے آپ؟"

"بی بی جی نے مہربانی کی ہو گی!"

"نہیں" وہ مشین کی طرح بول اٹھی۔ "آپ کھا تو لیجئے۔"

"تو پھر تم لائی ہو؟"

وہ خاموش رہی، میز پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھا کر ایک بکس پر رکھ دیا۔ اور گردن کو کھجا کر مسکرانے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نوکرانی کو نام سے کون پکارتا ہے جی!" وہ بولی "ویسے میرا نام بلقیس ہے۔"

اور پھر پلٹتے ہوئے کہنے لگی "دیکھئے بی بی جی کو نہ بتایئے گا۔ پلیٹ میں خود ہی آکر لے جاؤں گی۔"

"کب؟"

"شام کے بعد!"

"شام کے بعد؟"

اور وہ مسکرا کر باہر چلی گئی۔

○

اوسط درجے کے گھر کی ایک ادنیٰ سی ملازمہ کی آخر بساط ہی کیا ہوتی ہے لیکن دوسرے ہی دن وہ مسعود کے پاس ایک رومال لے آئی۔ خالص شیشم کا رومال، جس کے کنارے پر تیر سے چھدا ہوا دل کڑھا تھا ــــــ لال دھاگے سے۔

مسعود چوبیس گھنٹے بلقیس کی اس عجیب و غریب توجہ کی تاویلیں کرتا رہا۔ مگر اگلے روز ٹھیک اسی وقت بلقیس آئی اور ایک نہایت پیاری سی ننھی سی گھڑی اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولی۔

"یہ آپ کے کام آئے گی، میں کیا کروں گی اسے اپنے پاس رکھ کر، دنوں سے بیکار پڑی ہے۔"

اور پھر تحائف کا ایک طوفان شروع ہو گیا۔ بلقیس نت نیا تحفہ لے کر آتی۔ مسعود اسے ٹالتا، سمجھاتا، ڈراتا۔ لیکن اس نے بس ایک ہی رٹ لگائے رکھی۔

"ایک غریب کا تحفہ قبول کرنے میں آپ کو اتنا کچھ سوچنا پڑتا ہے ــــــ میری قسمت ــــــ!"

بار بار مسعود کو یہ خیال پریشان کر دیتا کہ آخر بلقیس اتنی غریب ہو کر تحائف کے یہ انبار کہاں سے لاتی ہے، اور کیا سونے کے دانتوں والی پڑوسن کو اس بات کی خبر نہیں کہ جس مسٹنڈے کے لیے اس نے پہلے روز کی جھڑپ کے فوراً بعد لذیذ چاولوں کی ایک پلیٹ بھجوائی تھی۔ وہ اب بلقیس کے تحائف سے لدا پھندا چھت پر نہیں چڑھ سکتا۔

بلقیس سانولی سہی، گول مٹول سہی، مگر وہ جوان تھی اور اس کے دانتوں کو سنہری غلافوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی "اوئی" میں چلبلاہٹ تھی۔ کھسیانہ پن نہ تھا۔ وہ مسکراتی تھی تو ساری دنیا دم سادھ لیتی تھی۔ وہ دروازے کے قریب مسعود کو پلٹ کر دیکھتی تھی تو کائنات ایک پھریری سی لے کر سنبھل جاتی تھی۔ اس کے گیتوں میں نئے نئے پلٹے نمودار ہونے لگے، اور ان کا موضوع بھی بدل گیا۔ اب وہ "پیا، رین اک پل میں بیتی" اور "تورے نین میں امرت چھلکے!" گاتی تھی، اور کبھی کبھی مسعود کے دالان کے بند دروازے پر کھٹاک سے انگوٹھی مار کر ہولے ہولے کہتی تھی۔ "تورے نین پیا، تورے نین!"

لیکن بلقیس ایسی غریب لڑکی کی محبت کو صرف حیرت اور تعجب کی بنا پر فراموش کر دینا مسعود کے لیے ممکن نہ تھا۔ سوچتے سوچتے آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے صرف بلقیس سے مطلب ہے، تحائف کی اس بھرمار کو علم النفسیات کے ماہرین ہی جانیں۔ وہ ان تحائف کو ایک پوٹلی میں محفوظ رکھتا گیا۔

○

انہی دنوں سلطان نے گاؤں سے اسے خط لکھا کہ اس کی ماں کی علالت خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے' اس لیے مزید ایک ماہ کی چھٹی کی ضرورت ہے۔ مسعود نے اسے فوراً جواب لکھا کہ "جب ماں ایسی مقدس و محترم ہستی کی زندگی کا معاملہ ہے' تو ایک ماہ چھوڑ آٹھ دس ماہ گزار لو' میں ان آقاؤں میں سے نہیں ہوں' جو ملازم کے دل کو پتھر کا ٹکڑا سمجھ کر اس کے احساسات کی پروا ہی نہیں کرتے۔"

سلطان سے یوں مستقل طور پر چھٹکارا حاصل کر کے مسعود نے زندگی کے اس تسلسل کو توڑنا چاہا جس میں سوائے تحفوں' مسکراہٹوں اور کنکھیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک رات جب آسمان کی سیاہی بے شمار ستاروں کی وجہ سے اور گہری ہو گئی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا سے بڑے کمرے میں لٹکا ہوا کیلنڈر جھوم رہا تھا' وہ دالان میں جا کر پرمعنی انداز میں کھنکارا' اور اس کی مسرت اور حیرت کی کوئی حد نہ رہی' جب کچھ دیر بعد دالان کا دروازہ کھلا' بلقیس اندر آئی اور آہستہ سے بولی۔

"جی فرمایئے۔"

یہ مسعود کی زندگی کا شگفتہ ترین دن تھا۔ پہلی مرتبہ اس نے سنے سنائے انداز میں اظہار محبت کیا' پہلی مرتبہ اس نے بلقیس کے سانولے رنگ کی تعریف کی اور کہا۔

"یہ ہے اصلی ہندوستانی رنگ' میں تو اسے قومی رنگ کہوں گا' اسی لیے تو میں چاکلیٹ پسند کرتا ہوں۔"

اس نے بلقیس کے گندھے ہوئے بالوں کو داغ کے ایک شعر کی مدد سے "دامِ صیاد" کا نام دیا' اور پھر زبان کے بے حد و حساب معجزے دکھانے کے بعد بولا۔

"یہ اتنے تحفے تم کہاں سے لاتی ہو بلقیس؟"

بلقیس سٹ پٹا گئی۔

"آپ تو بس یہی سوال کرتے ہیں مجھ سے' آپ مجھ کم بخت کی محبت کو دیکھتے نہیں' تحفوں کی بابت ہی سوچتے رہتے ہیں' آسمان سے آتے ہیں یہ تحفے ـــــ بس ـــــ اب ہوئی آپ کی تسلی؟"

"برا مان گئیں؟" مسعود نے کہا اور اس کی گردن پر ہلکی سی چپت لگا کر بولا۔

"شریر ـــــ!"

بلقیس نے بھی مسعود کے ہلکی سی چپت لگا دی' دل دھڑکنے کی بجائے بھڑک اٹھے' فلیٹ جھولنے لگا' اور بجلی کے قمقمے سے ایک موٹا سا پتنگا ٹن سے ٹکرا کر شیشے سے چمٹ کر رہ گیا ـــــ اور پھر پتنگوں کا کوئی ایک دن تو مقرر نہیں۔

○

ساری بلڈنگ میں مسعود کی شرافت' خاموش طبعی اور گوشہ نشینی کے چرچے ہو رہے تھے۔ ہوٹل والا خاص طور سے مسعود کی دیانت داری اور نجابت کا معترف تھا۔ بلڈنگ کے مالک نے بھی ایک مرتبہ مسعود سے کہا تھا۔ "مسعود صاحب آپ پہلے مجرد ہیں جو اس بلڈنگ میں آکر فرشتے بنے رہے' ورنہ یہاں تو جو بھی آیا' کوئی گل کھلا کر ہی نکلا۔ میں تو ان مجردوں سے تنگ آچکا تھا۔ مگر آپ نے ـــــ" اور اس نے رک کر ایک گوری چٹی سائیکل سوار لڑکی کو یوں تن کر آنکھ ماری تھی کہ اگر لڑکی میں ذرا بھی حیا ہوتی تو بجلی کے کھمبے سے جا ٹکراتی۔

سلطان کو گئے پانچ مہینے ہو چکے تھے کہ ایک روز اچانک اس کی چٹھی

آنکلی "میری ماں فوت ہوگئی ہے' اب سوائے آپ کے میرا اس دنیا میں کوئی نہیں' میں بہت جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

مسعود سلطان کو روکنے کی سبیل سوچنے لگا۔ کوئی تجویز نہ سوجھی' دیر تک کمروں میں ٹہلتا رہا' کھڑکی کے قریب بیٹھ کر سامنے کوٹھی کو دیکھتا رہا جس کے برآمدے کا ٹاٹ مدت سے اٹھ چکا تھا اور جہاں اب گوری پنڈلیوں کے بجائے درزی بیٹھے خاکی وردیاں سی رہے تھے۔ بلقیس سڑک پر ایک خوانچے والے سے خطائیاں خرید رہی تھی' اور بلڈنگ کا مالک ایک اینگلو انڈین لڑکی کو سگریٹ پیش کر رہا تھا۔

لیکن سلطان اس کے دماغ پر اس شدت سے سوار ہو چکا تھا کہ باہر کی دلچسپ دنیا کی کوئی چیز اسے بھلی نہ لگی۔ اس پریشانی کے عالم میں بلقیس کا سامنے آجانا سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ وہ آج اپنے خاص وقت سے چار پانچ گھنٹے قبل ہی چھت پر چڑھ گیا۔ پیپل کے درخت پر بہت سے پرندے بیٹھے تھے' آسمان بالکل صاف تھا' چیلوں کے ساتھ ساتھ زرد رنگ کے چند طیارے بھی اڑ رہے تھے' وہ چھت کے ایک سرے پر جا کر پلٹا۔ سامنے دیکھا تو سنہری دانتوں والی پڑوسن ستاروں سے بھرپور دوپٹہ اوڑھے حدِفاصل پر ٹھوڑی رکھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زرد رنگ کا ایک ہوائی جہاز ہوا میں پلٹے کھاتا اچانک سنبھلا اور اس کے سر پر سے چھلاوے کی طرح گزر گیا۔ پیپل پر بیٹھے ہوئے پرندے پتوں کی طرح ہوا میں بکھر گئے' مسعود کی سوچوں کی طرح ——— اس نے بے پروائی سے پلٹ کر نیچے سڑک کو دیکھا۔ بلقیس خطائیاں لے کر واپس آرہی تھی' اور بلڈنگ کا مالک اینگلو انڈین لڑکی کے سائیکل کو اپنے نوکر کے حوالے کر کے اسے موٹر نکالنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

لیکن مسعود کو تو سلطان کی آمد کا خیال مارے ڈالتا تھا۔

وہ پھر چھت پر ٹہلنے لگا۔

آپ ہی آپ اس کی نظریں حد فاصل کی طرف اٹھ گئیں۔ گورا چہرہ اپنے چمکتے ہوئے دانتوں سمیت وہیں پڑا تھا۔ مسعود نے اب کے جرأت سے کام لیا اور اسے گھور کر بولا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟"

پڑوسن نے اپنے فلیٹ کے دالان میں نظریں دوڑا کر کہا۔

"دیکھ رہی ہوں کہ آپ وہ گھڑی کیوں نہیں باندھتے؟"

"کونسی گھڑی؟" مسعود کو دھکا سا لگا۔

"اور یہ دیکھ رہی ہوں کہ وہ ریشمی رومال آپ شاید استعمال نہیں کرتے۔"

"کون سا رومال؟"

"اور آپ نے سینٹ تو کبھی لگائی ہی نہیں' جس کے ایک قطرے سے سارا لاہور مہک اٹھے۔"

"سینٹ؟" مسعود نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور وہ بولی: "اچھا تو آپ کو یہ چیزیں ملی ہی نہیں' معاف کیجئے گا' میں نے خواہ مخواہ آپ کو گھبرا دیا۔"

اور پلٹ کر اس نے دالان میں جھانکا۔

"بلقیس!"

"جی آئی۔" آواز آئی۔

"نہیں نہیں' وہیں ٹھہرو۔" پڑوسن چلّائی۔ اور پھر حواس باختہ اور پریشان نیچے اتر گئی۔

مسعود بھی فوراً اپنے فلیٹ میں آگیا' کیونکہ حالات کے اس عجیب و غریب پلٹے کے بعد اسے پناہ کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد ساتھ کے فلیٹ سے جو شور اٹھا ہے' اور اس میں "مسعود صاحب مسعود صاحب" کے نعرے بلند ہوئے ہیں' تو کچھ دیر تک مسعود اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھا۔

"اپنا نام کر کے دیتی رہی ہے' چوری کر کے تحفے بھیجتی رہی ہے' مسعود صاحب کو' لے آ' سب چیزیں لے آ' واپس لے آ سب کچھ ——" اور پھر دھم دھم کی آوازیں جیسے اناج سے بھری ہوئی بوری کو کوٹا جا رہا ہو۔

لیکن بلقیس بالکل خاموش تھی۔ کچھ دیر کے بعد دھڑام سے پڑوس کا دروازہ کھلا' اور روتی بسورتی ہوئی بلقیس سیڑھیاں اترنے لگی۔

لپک کر مسعود نے اس کے تمام تحائف کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں ٹھونس دی۔ وہ رک کر آنسو پونچھنے لگی۔ پلٹ کر دروازے تک آئی۔ پوٹلی کو گھما کر شاید پڑوسن کے قدموں میں دے مارا' اور پھر سیڑھیوں کا رخ کرتے ہوئے مڑ کر مسعود کی طرف بولتی ہوئی آنکھوں سے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہے "تم نے تو میری چیزیں واپس کر دیں' مگر میں جو تمہاری امانت اٹھائے پھرتی ہوں وہ؟ ——"

اور سنہری دانتوں والی پڑوسن چلّائی۔

"اب دفعہ بھی ہو حرامزادی —— خواہ مخواہ مجھے بھی اور مسعود صاحب کو بھی بدنام کرے گی —— دور بھی ہو نظروں سے ——"

اور جب کچھ دیر کے بعد سلطان آنکلا تو مسعود سے بڑے تپاک سے مل کر بولا۔

"یہ پوٹلی پڑی تھی دہلیز پر —— اور ہاں حضور! سنا ہے' وہ پڑوس کی

نوکرانی چوری کے الزام میں نکال دی گئی' آپ کی تو کوئی چیز نہیں لے گئی؟ ——"

اور مسعود نے تازہ اخبار کو پرزے پرزے کر کے نالی میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "کل سے کوئی دوسرا مکان تلاش کرو۔ یہاں کے نلکوں کا پانی کھاری ہے!"

انصاف

ایک ننھا سا سبز کیڑا پتہ پر سے پھسلا۔ اس نے اپنے جسم کے ہر ننھے عضو کو پتے سے چمٹ جانے کے لیے اکڑا لیا۔ لیکن بے چارہ منہ کے بل نیچے ندی میں گر گیا۔ دو ایک ننھے سے بل کھا کر تڑپا اور پھر تنکے کی طرح لہروں پر اچھلتا ہوا دور نکل گیا۔

نیاز احمد محویت میں مٹی سے بھری ہوئی چھنگلیا دانتوں میں دبائے بیٹھا رہا۔ اور جب ندی کنارے کی مٹی کی مخصوص سوندھی سوندھی بو اس کے دماغ میں بس گئی تو وہ ایک لمبی سانس لے کر اٹھا۔ اپنی ننھی سی ناک اوپر چڑھا کر بھوؤں کے پاس لے گیا۔ اور ندی میں زور سے تھوکا۔ آستین سے ہونٹوں کو مل کر گردن کو کھجایا اور چپ چاپ اپنے گھر آگیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور ماسٹرجی نے اسے تین سو ننانوے سوالات حل کرنے کے لیے دیئے تھے۔ جس روز چپراسی سبز رنگ کی جلد والا رجسٹر لے کر کمرے میں داخل ہوا اور ماسٹرجی باآواز بلند پکارے کہ پندرہ جولائی سے پندرہ ستمبر تک اسکول بند رہے گا' اس دن نیاز احمد کا بس چلتا تو اچھل کر کمرے کی چھت پر مکڑیوں کے جالے چھو آتا۔ لیکن بس بینچ پر پہلو بدل کر رہ گیا اور جوشِ مسرت میں پنسل پر اس قدر زور دیا کہ سکہ تراق سے ٹوٹ کر ماسٹرجی کے سامنے جا گرا۔

"کس نے کی ہے یہ شرارت؟" ماسٹرجی نے اس زور سے نتھنے پھیلائے کہ ان کے اندر بالوں کا ایک جنگل صاف نظر آنے لگا۔

لڑکے سہم گئے۔ نیاز احمد نے پنسل کو شلوار کے نیفے میں اڑس لیا۔ تلاشی ہوئی۔ نیاز کے پاس پنسل سرے سے موجود ہی نہ تھی' مجرم کیسے بنتے۔ بدقسمتی سے موہن کی پنسل ٹوٹی ہوئی تھی۔ ماسٹرجی نے اسے دونوں کانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ابے تربوز! تو بھی شرارتیں کرتا ہے؟"

موہن اپنے پھولے ہوئے سرخ گالوں کو اور پھلاتے ہوئے بولا۔

"ماتا شلوار میں ازار بند ڈالنے لگیں کہ سکہ ٹوٹ گیا۔ ایشور کی قسم پنسل ماتا نے توڑی!"

"ماتا کا بچہ!" ماسٹرجی نے اسے بنچ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

موہن کی کمر پر جیسے کسی نے مگدر جما دیا۔ سوچنے لگا۔ "بڑا آیا وہاں سے نارمل کی سند لے کر' ابا کے سامنے آئے تو وہ انگریزی سے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں۔ میری کمر توڑ ڈالی۔"

نیاز موہن کی تکلیف دیکھ کر بے کل ہو گیا۔ اٹھا' نیفے سے پنسل نکال کر ماسٹرجی کے سامنے دھری اور کہا "سکہ مجھ سے ٹوٹا ہے' اس میں موہن کا قصور نہیں۔"

ماسٹرجی بے اختیار مسکرا کر رہ گئے اور کہنے لگے۔

"شاباش بچے! تو ایک دن منصف بنے گا۔"

نیاز کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

لڑکے اسے احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ نیاز کو اپنا بنچ ساری جماعت سے اونچا نظر آنے لگا۔ ماسٹرجی کی کرسی سے بھی اونچا۔

اور اسی لیے اس روز سبز کیڑے کی بے بسی دیکھ کر اس کا ننھا سا دل بے کل ہو اٹھا۔

جب نیاز بی اے پاس کرنے کے بعد تھانیداری کے لیے پھلور بھیج دیا گیا تو ماسٹر جی کی پیشگوئی اسے اچھی طرح یاد تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ "آخر تھانے دار اور منصف میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں قانون کے نگہبان، حق کے ساتھی، سچائی اور انصاف کے علمبردار! آخر تھانیدار اور منصف میں فرق کیا ہے!؟"

ایک سال تک پھلوار کے کھلے میدان میں دوڑتے دوڑتے اس کے پٹھوں میں فولادی قوت آگئی اور شانوں کی مچھلیاں ابھر آئیں، جیسے لوہے کے رسے لپیٹ دیئے ہوں، صاف اور سرخ چہرے میں آنکھیں سمندر کے ساحل پر بکھری ہوئی سیپیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ چوڑی چھاتی، گٹھا ہوا بدن، کھچا ہوا قد! واپس گھر آیا تو دیکھنے والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"ہائیں! کیا یہ نیاز احمد ہی ہے۔"

ہر ایک تعجب سے چلا اٹھا اور نیاز احمد اکڑتا ہوا تپتی دوپہروں میں گلیوں کے چکر کاٹتا اور سوچتا۔

"اب حق زندہ ہوگا۔ اب انصاف سکون کا سانس لے گا۔ اب قانون کروٹ بدلے گا۔"

نیاز ضلع کے صدر مقام میں مقرر کر دیا گیا۔

چند دنوں کے بعد اسے ایک مقدمے کی تفتیش کے لیے انتخاب کیا گیا۔ شہر کے گندے نالے کے کنارے پولیس کو ایک لاش پڑی ملی تھی اور چند قدموں کے مبہم نشانات کے سوا کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے قاتل کا سراغ مل سکتا۔ نیاز نے موقع پر جا کر پوری کوشش سے تفتیش شروع کر دی۔ شہر سے لے کر گندے نالے تک دو آدمیوں کے قدموں کے نشانات کے سوا اور کوئی

ایسی بات نہ تھی جس سے قاتل کا سراغ مل سکتا...... ایک جگہ ایک شخص کے قدم مڑ جاتے تھے، اور شہر کے قریب جا کر پھر واپس اسی جگہ آن ملتے تھے اور گندے نالے کے عین کنارے پر دو اشخاص کے گتھم گتھا ہونے اور لڑنے کے الجھے ہوئے نشانات تھے۔ پھر خون کے چھینٹوں کے نشان اور دس قدم پر ایک خون آلود نعش جس کے قلب میں ایک چھرا نصف دستے تک گھسا ہوا تھا۔ کھوجی بلوائے گئے، ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ مقتول کو اکیلا چھوڑ کر قاتل کا واپس شہر کو آنا، اور شہر کے قریب پہنچ کر اچانک لوٹ جانا اور اسے قتل کر ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے؟

مقتول کی شناخت ہوگئی۔ وہ شہر میں ایک وکیل کے پاس ملازم تھا۔ وہاں جا کر پوچھا گیا کہ پچھلے دو چار دنوں میں مقتول کے پاس کون اجنبی شخص آیا تھا—— ملازموں نے بتایا کہ ایک سانولے رنگ کا نوجوان، جو اب بھی مکان کے پچھواڑے گھر کے دوسرے ملازموں کے ہمراہ بیٹھا ہے، آٹھ روز ہوئے مقتول کے پاس آیا اور اسی کے ہاں ٹھہرا رہا۔ اب بھی کل سے اس کا منتظر بیٹھا ہے اور اس کے نہ آنے کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔

سپاہ نے ملازموں کے کوارٹروں کی طرف جا کر اللہ داد کو دبوچ لیا، اور کوتوالی میں لا کر اس کی خوب مرمت کی، مگر وہ چلّائے جا رہا تھا۔ "میں مقتول کا بہت عزیز دوست ہوں۔ اور میں اسے ملنے کے لیے دس دن کی چھٹی لے کر یہاں آیا ہوں، وہ کل کسی گاؤں میں ایک کام کے لیے گیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ شام کو واپس آجائے گا۔ لیکن وہ آج دوپہر تک واپس نہیں آیا۔ مجھے نہیں معلوم اسے کس نے قتل کیا ہے۔ مجھے مارنے سے پہلے مجھے اس کا چہرہ دکھا دو—— ہائے میرا مظلوم بھائی! میرا دوست!"

نیاز کے گھونسوں اور سپاہیوں کے بھاری بھرکم بوٹوں کی ٹھوکروں نے

اس پر کوئی اثر نہ کیا اور وہ برابر چلاتا رہا کہ "مقتول کی لاش میرے سامنے لاؤ' پھر بے شک مجھے گھونسوں سے بھوسہ بنا ڈالنا۔"

لیکن نیاز کو حق بات کی تلاش کی دھن تھی۔ مارتے مارتے خود تھک گیا اور ستانے کے لیے بیٹھا تو معاً اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ نہایت دلاسے سے اللہ داد سے پوچھا۔

"لے بھائی! اب ہماری ہمت جواب دے گئی ہے۔ ہمیں صرف اتنا بتا دے کہ مقتول کا گھر کہاں ہے اور اس کے کوئی اہل و عیال بھی ہیں؟"

اللہ داد کے زرد چہرے پر سرخی آگئی اور اس کا جسم جو گھونسوں کی بوچھاڑ سے اکڑ کر مرجھا گیا تھا' پھول کی طرح کھل گیا' وہ بولا:

"تھانیدار جی! آپ نے میری آزادی کی سبیل خود پیدا کر دی۔ میرے مرحوم دوست کی بیوی خود گواہی دے گی کہ مجھ سے زیادہ اس بیچارے کا کوئی عزیز نہ تھا۔ آپ اسے بلوا بھیجئے' میں اور کوئی گواہ نہیں چاہتا۔"

اور آخر سرکاری ذریعے سے مقتول نور الٰہی کی بیوی بلا لی گئی۔

نیاز احمد کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اگر اس عورت نے بھی اس شخص کے خلاف کچھ نہ کہا' تو پھر ثبوت کیسے مہیا ہوگا۔ اس کی پہلی کوشش کیسے کامیاب ہوگی۔ آج اسے اپنے بوڑھے استاد کی پیشگوئی کی صداقت دنیا پر ظاہر کرنی تھیں۔ چق کو حرکت ہوئی اور ایک نازک کنول کے پھول سا پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ روئی کے گالے کی طرح بے آواز! نیاز احمد کی نبضیں جن میں قانون جوش مار رہا تھا' اچانک کسی اور دھن میں دھڑکنے لگیں اور جب اس نے آنکھ اٹھا کر سامنے دیکھا تو سمجھا گویا اس کا دماغ سُن ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی انگلیاں ڈھیلی پڑنے لگیں اور قلم چھوٹ کر صاف قمیض پر چھینٹیں ڈالتا فرش پر گر پڑا۔ روشندان میں ایک نیلے کبوتر نے گردن کھینچ کر کہا "غٹرغوں ——

غٹرغوں ——" جیسے "ہوشیار" کا ایک نعرہ لگا کر پہرہ دار غافل دکانداروں کو جگا دیتے ہیں۔

نیاز احمد نے رومال سے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پلکوں کی آڑ سے اسے پھر دیکھا۔ حسن اور جوانی کا مجسمہ نظریں نیچے کئے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو دبا رہا تھا۔ نیاز احمد نے فرش سے قلم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لڑکی ——!"

اس نے اسے لڑکی کہہ کر پکارا کیونکہ ابھی تک وہ عورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر رنگ تھا' بالوں میں چمک تھی' آنکھوں میں جادو تھا۔ اعضاء میں غیر محسوس لچک تھی اور سانس لیتے ہوئے اس کے سارے جسم میں مبہم سا لوچ تیر جاتا تھا۔

"لڑکی —— تم مقتول نور الٰہی کی بیوی ہو؟"

لڑکی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے آنسو روکنے کے لیے منہ میں اپنا سبز آنچل ٹھونستے ہوئے کہا۔

"جی۔"

"سچی بات بتاؤ گی؟"

اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"جی۔"

اور آنسو پلکوں سے پھسل کر اس کے سینے پر گر گیا۔

"اللہ داد کو جانتی ہو؟"

"جی۔"

نیاز احمد کی کرسی جیسے ہولناک سمندروں کی کف آلود ہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور "جی' جی" کی یہ تکرار! جیسے کوئی مغنی بیٹھے بیٹھے بربط

کے ایک ہی تار کو بار بار چھیڑ دیتا ہو!

نیاز احمد نے کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔

"کب سے جانتی ہو اسے؟"

"بہت دنوں سے۔"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"زیبو!"

"پورا نام؟"

"زیبو ——— جی!"

"آخر تمہارے ماں باپ نے کیا نام رکھا تھا تمہارا ——— پورا نام؟"

"وہ بھی زیبو ہی کہتے ہیں۔"

نیاز اپنی آنکھوں میں غصے کی جھلک نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تھانہ ہے' یہاں جھوٹ نہیں چھپ سکتا۔"

اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی پتلیاں آنسوؤں کے ایک گہرے پردے میں چھپ گئیں۔ جیسے اس نے اپنی باریک سیاہ بھوؤں کے نیچے دو سیپیاں رکھ لی ہوں۔ سفید اور چمکتی ہوئی' لیکن بصارت سے محروم ——— اور جب نیاز نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"بولو گی یا نہیں؟"

تو خوف سے اس کی پلکیں جھپک گئیں اور آنسو اس کے سینے اور فرش پر یوں گرے' جیسے کسی الھڑ چھوکری کی پھٹی ہوئی جیب سے گڑیا کی بالیوں کے سفید سفید موتی اچانک لڑھک کر گلی میں بکھر جائیں۔

"اللہ داد کے متعلق تمہیں کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں!"

"نور الٰہی اور اللہ داد کا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہ تھا؟"

"نہیں جی ——— کبھی نہیں! بالکل نہیں جی!"

"تمہیں کس پر شک ہے ——— یہاں اس شہر میں تمہارے خاوند کا کون دشمن ہے؟ ———"

"میں تو گاؤں میں رہتی ہوں' میں اِدھر کبھی نہیں آئی۔"

نیاز احمد نے سوچا' یوں کام نہیں بنے گا۔ ان نرم باتوں سے عورت کے دل کی خلوت سے اتنا بڑا راز اگلوایا نہیں جاسکتا۔ اور پھر عورت پر ہاتھ کون اٹھائے' انصاف کو ٹھیس لگے گی۔

وہ دفتر سے اٹھ کر گھر آیا۔

دیر تک بیٹھک میں بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ اگر وہ ناکام رہا تو اپنے بڑے افسروں کو کیا جواب دے گا۔ جہاں کہیں وہ دکھائی دیں گے ان سے کترانے کی کوشش کرے گا۔ سپاہی اسے یوں ڈٹ کر سلام نہ کریں گے' جیسے آج کل کرتے ہیں۔ اس کے اس لمبے قد اور وجیہہ چہرے کی کوئی وقعت نہیں رہے گی۔ اب کیا کیا جائے۔

اچانک اس کے جی میں ایک تجویز آئی' اور وہ کرسی پر اچھل پڑا۔ اس نے اٹھ کر سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے بونبے اڑاتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر تبسم تھا اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک! جیسے برسات کی اندھیری راتوں میں جگنو چمکتے ہیں۔

زیبو اس رات نیاز کے گھر سوئی۔

نیاز کی بیوی نے اس کی خوب خاطر مدارت کی' اور اس کی دلدہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور جب وہ صبح کسی کام کے لیے باہر نکلی تو بیٹھک میں اس نے نیاز پر نگاہیں گاڑ دیں اور دور تک آنچل سنبھالنے کے بہانے پیچھے مڑ مڑ

کر دیکھتی گئی۔

نیاز احمد کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔ ہونٹ اور کھل گئے۔ کامیابی اور کامرانی کی دیوی اس کے تصور کے آنگن میں رقص کرنے لگی۔ اس کے گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ اور مڑی ہوئی ہتھیلیوں کی جادو بھری جنبش ——— !کنول کے ڈنٹھلوں ایسے بازوؤں کا لوچ! یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ساری کائنات اس کی باہوں کے اوپر نیچے ہونے سے کسی پریشان دل کی طرح دھڑک رہی ہے۔

اور جب زیبو لوٹی تو نیاز بیٹھک کے دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ اس کے قریب سے گزری تو نیاز نے دھیمی اور پیار بھری آواز میں کہا۔

"زیبو رانی!"

زیبو ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ اور نیاز کی طرف دیکھنے لگی جیسے اس نے جانے بوجھے اس کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا ہے۔

"زیبو رانی———!" نیاز نے یہ الفاظ اسی انداز میں دہرائے۔ زیبو کی پلکیں جھک گئیں۔ آنکھیں پتھرا سی گئیں، بولی۔

"جی۔"

"زیبو رانی!"

اب تو نیاز بیٹھے بیٹھے اچھل پڑتا۔ سوتے سوتے گانے لگتا اور کامیابی کی دیوی اپنی انگلیوں کی پوروں میں اپنے باریک لہنگے کے دامنوں کو تھامے ہوئے تھرکتی ہوئی اس کے دماغ کے پردے پر سے گزر جاتی۔ کپتان پولیس صاحب سگار سلگاتے اور مسکراتے ہوئے اس کے دماغ کی شریانوں میں گردش کرنے لگتے۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر نیاز نے زیبو پر ایسے ڈورے ڈالے کہ وہ ایک

بے بس ہرنی کی طرح اس کی ہو کر رہ گئی۔ ایک صبح نیاز نے زیبو کے بالوں کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھو زیبو! تقدیر کی بات ہے، تم کہاں کی رہنے والی ہو اور میں کہاں کا، تقدیر ہمیں اس قدر قریب لے آئی کہ اب ہم ایک دوسرے سے دوری کو موت کا پیغام سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

زیبو نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر آنکھوں سے تبسم برساتے ہوئے کہا۔ "ہوں۔"

"اچھا تو زیبو! کیا آج بھی تم مجھے اتنا نہ بتا سکو گی کہ تمہارے خاوند کا قاتل کون ہے؟"

"اللہ داد!"

نیاز نے چاہا کہ کامیابی کا ایک فلک شگاف نعرہ لگائے۔

"کیسے؟"

زیبو نیاز کے گھٹنے کو تکیہ بناتے ہوئے بولی۔

"میرا خاوند بہت بدصورت اور گندہ شخص تھا۔ میری اس سے کبھی نہ بنی۔ اس اللہ داد سے میں نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اسے جا کر قتل کر ڈالے تو میں اس سے بیاہ کر لوں گی۔ میں اصل میں اپنے خاوند سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں نے یہاں اللہ داد سے سب باتیں پوچھ لی ہیں۔ وہ یہاں آیا۔ سات آٹھ دن رہا۔ اسے وہ ایک رات دریا کی سیر کے لیے باہر لے گیا۔ گندے نالے کے کنارے اسے چھوڑ کر کسی بہانے سے واپس ہو لیا۔ وہ اس کا نہایت عزیز دوست تھا اور اس وقت اسے اپنا ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنے بچپن کے دوست کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے! لیکن شہر کے قریب پہنچ کر میرا خیال اس کی اس محبت پر غالب آگیا اور واپس جا کر اس نے اسے قتل کر

ڈالا۔"

نیاز نے پیار سے زیبو کے ہاتھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا زیبو تم پرسوں عدالت میں اس کا اقرار کر لو گی —— میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور دیکھو' فیصلے کے بعد ہم دونوں اکٹھے رہیں گے۔ میں مر کر بھی اپنے آپ کو تم سے جدا نہیں کر سکتا۔"

اور تیسرے دن عدالت میں جا کر زیبو نے اقرار کر لیا کہ اللہ داد کی اس کے مقتول خاوند سے زبردست دشمنی تھی اور اس نے ہی اسے قتل کیا ہے۔ اللہ داد یہ سن کر کٹہرے میں دھڑام سے گر پڑا۔ اس کا ایک ہاتھ کٹہرے کے جنگلے سے نیچے لٹک کر یوں حرکت کرنے لگا جیسے زیبو پر لعنت بھیج رہا ہے۔

کپتان پولیس نے نیاز کی زبردست سفارش کر دی۔

دن بھر نیاز کے گھر اس کے دوستوں اور عزیزوں کا تانتا بندھا رہا۔

اتنے پیچیدہ مقدمے کی ایسی قابل تعریف تفتیش آج تک کوئی تجربہ کار سے تجربہ کار تھانیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔

وہ سورج چھپنے سے ایک گھنٹہ قبل بیٹھک میں اکیلا بیٹھا تھا کہ دروازے کا پردہ ہلا اور زیبو اندر داخل ہوئی۔ نیاز اٹھ بیٹھا' اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

زیبو آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

"اب میرے بارے میں کیا حکم ہے جی؟"

نیاز گھبرا سا گیا۔ بٹوے سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر زیبو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو کرایہ تمہیں کافی ہو گا گاؤں تک!"

زیبو کا جیسے کسی نے اچانک خون چوس لیا ہو' وہ سرسوں کے پھولوں

کی طرح زرد پڑ گئی۔ نوٹ نیاز کے ہاتھ سے چھین کر پرزے پرزے کر کے فرش پر پھینک دیا۔ اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نیاز بولا۔ "لیکن زیبو تم جانتی ہو' میری ایک بیوی موجود ہے۔"

زیبو اپنا آنچل سنبھالتی' بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نیاز دیر تک ریشمی پردے کو لرزتا ہوا دیکھتا رہا۔

حق کا پرستار اور انصاف کا علمبردار نیاز جب شام کو ٹہلنے کے لیے باہر نکلا تو دریا کے کنارے اس نے ایک ننھے سے سبز کپڑے کو دیکھا جو پتے سے پھسلا۔ اس نے اپنے جسم کے ہر ننھے عضو کو پتے سے چمٹ جانے کے لیے اکڑا لیا۔ لیکن بے چارہ منہ کے بل نیچے ندی میں گر گیا۔ دو ایک ننھے سے بل کھا کر تڑپا اور پھر تنکے کی طرح لہروں پر اچھلتا ہوا دور نکل گیا۔

مہنگائی الاؤنس

ادھر لالہ مراری لال نے ہیڈ کلرکی کا عہدہ سنبھالا' اُدھر ان کے مزاج کا یک چھلکا اتر گیا۔ ہر وقت ہنستے' مسکراتے' گپیں ہانکتے مراری لال نے ایسی قلابازی کھائی کہ دفتر والے دم بخود رہ گئے۔ اب لالہ جی بات بات پر میز پر گھونسا جماتے' عینک کو ناک کے بانسے تک سرکا کر اور بھوؤں کو ماتھے کی لکیروں میں پھنسا کر کلرکوں کو گھورتے۔ ہر چپراسی کو الو کا پٹھا کہہ کر پکارتے' بازار سے گزرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے بدہضمی کے مریض ہیں۔ کوئی دکاندار سلام کرتا' تو سر کو خفیف سی جنبش دے کر جواب دیتے۔ "ہوں" ـــــ جس کا مطلب یہ تھا کہ "تجھے کس نے کہا تھا سلام کرنے کو ـــــ!" لیکن جونہی گھر میں قدم رکھتے اور کسم کو چوکے میں بیٹھا دیکھتے تو ان کا سارا نشہ جھاگ کی طرح فش فش بیٹھ جاتا اور وہ بچوں کے سے بھولپن سے کہتے "بیٹھی ہو کسم؟"

کسم نے ابھی تک اپنے اور اپنے پتی کے رن میں بیس برس کی طویل مسافت نہیں کاٹی تھی۔ اس نے اس صحرا کا تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ مسکراتی ہوئی اٹھتی اور آرام کرسی پر بکھرے ہوئے لالہ جی کی گدگدی پنڈلیوں کو سہلاتی۔ وہیں چولھے کے قریب گھونگھٹ نکالے دپنہ

اٹھا کر راکھ کو الٹتی پلٹتی۔ انگارے پر انگارہ دھرتی۔ ہنڈیا کے پیندے پر جمی ہوئی تہیں کھرچتی اور آنکھوں میں رس اور باہوں میں مس کی تمنائیں گھول کر تکان کی نامکمل انگڑائی لیتی اور پھر سینے پر اٹکے ہوئے دوپٹے کو مبہم سے جھٹکے سے گرا کر کہتی۔

"جی بیٹھی ہی ہوں' آپ کہیں تو کھڑی ہو جاؤں۔"

"واہ ـــــ!" لالہ مراری لال کان سے میل نکال کر چھنگلیا کو آرام کرسی کے میلے ٹاٹ پر مل دیتے۔ "میں تو چاہتا ہوں تم بیٹھی ہی رہو۔"

کسم کے گالوں پر گلاب کھل جاتے۔ لہجے میں لچک اور آواز میں جھجک پیدا کر کے کہتی "یعنی لولی لنجی ہو کر رہ جاؤں!"

لالہ جی تالی بجا کر ہنستے۔ الگنی سے لٹکے ہوئے پنجرے میں خواب دیکھتا ہوا طوطا چونک کر کہتا۔ "وارے نیارے' وارے نیارے!" اور پاجامے پر دھوتی باندھ کر نیچے سے پاجامے کو سرکاتے ہوئے کہتے۔ "کیسے پیارے بول سکھا دیئے طوطے کو۔ تمہارے آنے سے پہلے جانتی ہو یہ کیا بکتا رہتا تھا ـــــ کہتا تھا ـــــ

"مرجا' مار دے ـــــ مرجا مار دے۔"

"لیکن اب تو پچھلے چند دنوں سے کوی بن رہا ہے کم بخت ـــــ"

کچھ سوچ کر کہتے "کسم! تم میرے ساتھ "واک" پر چلا کرو۔"

"جی معاف کیجئے۔" کسم و پنہ سے پٹاخے چھوڑنے لگتی۔ "آپ جایا کیجئے واک پر' میرے نصیبوں میں تو اس ہرے ہرے کوی مہاراج کی کویتا سننا ہی لکھا ہے۔"

اچانک باہر سے لالہ امیر چند کی آواز آتی۔

"چلو واک پر چلیں مراری۔"

اور لالہ مراری لال شش سالہ گرگابی میں ایک چیتھڑا رکھتے ہوئے جواب دیتے۔ "دو منٹ ویٹ کرنا امیرچند! کم بخت پمپ شو میں ایک کیل ابھر آئی ہے۔" پھر ہولے سے کسم کو چھیڑتے۔ "اندر چلے آئیں امیرچند؟"

"جی معاف کیجئے!" کسم لالہ جی کو پمپ شو سے لے کر کنپٹیوں کے سفید بالوں تک دیکھتی۔ "وہ اتنے بڑے ہو کر بھی مذاق سے باز نہیں آتے۔"

"مجھ سے تو چھوٹے ہیں۔" لالہ مراری لال گرگابی میں پاؤں یا پاؤں میں گرگابی گھسیڑتے ہوئے کہتے۔

اور کسم کہتی۔

"ابھی پچھلے دنوں ہی میری ایڑیوں پر ہاتھی دانت کی گیندوں کی پھبتی کسی۔ اس کے بعد وہ کشتی والی پھبتی تو آپ کو بھی نہیں بھولی ہوگی۔ سن نہیں دیکھتے اپنا۔ آنکھوں کے کناروں پر مکڑیاں ٹانگیں پسارے پڑی ہیں اور چلے ہیں چھیڑ چھاڑ کرنے پرائی بہو بیٹیوں سے۔"

لالہ جی کسم کے گالوں میں جوانی کے گلابوں کے علاوہ غصے کے شعلے دیکھتے تو لہجے میں گھی مکھن ملا کر کہتے۔

"وہ میرے متر ہیں کسم' اور پھر پڑوسی ہیں۔ ان کے بارے میں ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ یہ کیا کم ہے کہ جب سے تم نے تیوری چڑھائی ہے میں انہیں اندر نہیں آنے دیتا۔ وہ خود بھی نہیں آتے' کہتے ہیں "کوئی ناگ رانی کی تصویر کھینچنا چاہے' تو کسم بھابی کو ماڈل بنا لے۔"

کسم تڑپ اٹھی۔

"لاج نہیں آتی آپ کو؟"

لالہ مراری لال مسکرا کر چھڑی سنبھالتے اور چوکے کی حد پر رک کر کہتے۔

"اچھا تو اسی وقت پر لوٹیں گے ہم —— بھوجن تیار ہوگا نا؟"

—— اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ڈیوڑھی کی طرف پلٹتے اور کہتے۔

"آج ویدر بھی فائن ہے امیرچند! آج تو بہت لمبی واک کو جی چاہتا ہے۔"

اور جب لالہ جی چلے جاتے تو کسم کی رگوں میں جھنجھناہٹیں بیدار ہو جاتیں۔ آنگن کی ویرانی گول مول پرچھائیوں سے بھر جاتی۔ ڈیوڑھی کا ادھ کھلا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگتا۔ اور لالہ امیرچند کے بالا خانے پر سے ان کی لڑکی کے دھیرے دھیرے گانے کی آواز آتی تو یہ الاپیں اس کے کانوں کے قریب کوئی آسیبی رقص کرتیں۔ وہ ہنڈیا کے ڈھکنے کو کھسکا کر بڑبڑاتے ہوئے آلوؤں کو چمچے سے الٹتی پلٹتی۔ رکی ہوئی بھاپ راستہ پا کر ابھرتی اور کسم کے گرد و پیش کو نم آلود کرتی ہوئی تحلیل ہو جاتی۔ اٹھ کر وہ طوطے کو کچوکوں سے اکساتی۔ وہ اپنے پروں کو پھیلا کر اور چونچ کو کھول کر چلاتا۔

"وارے نیارے —— وارے نیارے۔"

"رام رام کر!" کسم سلاخوں پر دپنہ بجا کر کہتی۔ "رام نام کے جاپ میں مکتی ہے۔ نگوڑے' بول رام رام۔"

"وارے نیارے!" طوطا سلاخوں سے چمٹ کر بلبلاتا۔

"رام رام!"

"وارے نیارے!"

اور وہ انگلیوں کی گلابی پوروں کو سہلا کر سوچتی۔

"تو بکواسی ہے' جانے کون سی بری گھڑی تھی کہ تجھے یہ بول سکھا دیئے۔ یہاں وارے نیارے نہیں ہوتے۔ یہاں لمبی لمبی واکیں ہوتی ہیں' اس راکھشس امیرچند کے ساتھ جو ہنستا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بڑا سا پھوڑا پھس پڑا ہے۔"

جب لالہ مراری لال نے پہلی پتنی کے سوگ سے فارغ ہو کر کسم کے
معاملے میں سلسلہ جنبانی شروع کی تو اس کے لیے ہیڈ کلرکی کی سفارش ہو چکی
تھی۔ یہی سفارش دراصل اس بیاہ کی سفارش ثابت ہوئی۔ اور پھر لالہ جی
سارے شہر میں اپنی زندہ دلی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے قہقہوں کی فلک شگافی
ضرب المثل بن چکی تھی۔ چٹکلے سن کر یا سنا کر سامنے پڑی ہوئی میز پر اس زور
سے گھونسا جماتے کے سوڈا واٹر کی بوتلیں جلترنگ بجانے لگتیں اور شیشے کے
گلاس لڑھک جاتے۔ جوانی کا عمر سے تو کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ یہ تو مزاج کی
گھلاوٹ سے عبارت ہے۔ اور لالہ مراری لال کے مزاج میں تو پھلجھڑیاں اور
پھول کھلے ملے تھے۔ پہلی پتنی سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی لیکن وہ کبھی
اداس نہ دیکھے گئے۔ کہتے تھے۔ "جب ایشور دے گا تو ہمیں پتہ بھی نہیں چلے
گا۔ اور دھم سے آجائے گا تھن متھنا سانولا سلونا بچہ ——— آخر اس میں فکر کی
کونسی بات ہے!"

کسم کے پتا نے لالہ مراری لال کے سن کے مدنظر ایک مرتبہ اعتراض
کیا تو تھا مگر کسم کی ماتا بھڑک اٹھی تھی۔ "واہ! میں نے تو جب بھی دیکھا ہے
مراری کو، یوں لگتا ہے، جیسے آپ ہی گھومتے پھر رہے ہیں!"

کسم کے پتا کو اپنی مونچھوں میں کہیں کہیں سفید تاروں کا احساس تھا مگر
وہ اس غیر محسوس عذر گناہ کا کوئی رد پیش نہ کرسکے۔ اور اپنی چھڑی کو بے تابانہ
گھماتے خاموش ہو رہے۔"

کسم نے بھی اندر ہی اندر کئی بل کھائے تھے۔ بیماری کا بہانہ کیا تھا اور
پھر سچ مچ بیمار بھی ہوگئی تھی۔ ماتا کو کئی چپ چاپ اشارے کیے۔ میلے لباسوں،
بکھرے بالوں اور مری مری مسکراہٹوں کے کئی تیر چھوڑے، مگر وہاں تو لالہ
مراری لال کے سر پر متوقع ہیڈ کلرکی کا مکٹ ان کے چہرے پر بچپنے کی معصومیت

برسا رہا تھا۔ کسم کو کونین کھلائی گئی، جوشاندے پلائے گئے، اسے ایک مہامنتری
کی اشیرواد بھی ملی۔ اور جب بندھن کی تاریخ قریب آگئی، تو کسم نے سوچا۔
کیوں نہ بھری برادری میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں، اور چیخ چیخ کر کہہ
دوں کہ "نہیں کرتی شادی، میں ایشور کی بھگتی کروں گی۔ میں دیو داسی بنوں گی،
مجھے مکتی چاہیے ——— !" مگر یہ الفاظ اس کی ان نبضوں ہی میں دھڑکتے رہ گئے
جو نگوڑیاں عجیب عجیب مقامات پر ابھر آتی تھیں۔ آخر نچلے ہونٹ کے خم اور
کانوں کی لووں اور انگلیوں کے پوروں میں نبضوں کا کیا گزر، مگر وہ تو کئی مرتبہ
ایک اچھا خاصا ساز سا بن جاتی تھی، جس کے ہر تار پر کسی ان جانے مضراب کی
چوٹ پر چوٹ پڑتی رہتی تھی۔

دن کو تو خیر عورتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ البتہ رات کو وہ اپنے خیالوں
کی محفل سجاتی۔

لالہ مراری لال کتنے نئے نئے اور انوکھے رُوپوں میں آتے، مگر اچانک
ان کے چہرے پر ایک استخوانی ہاتھ جالی سی کاڑھنے لگتا۔ اور کسم کروٹ بدل کر
نئے خیالوں کو بلا لیتی۔ اس نے کئی ایسے ارادے بھی کیے، جو کمرے کی کھڑکیوں
سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ویران سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے آوارہ
نوجوانوں کے گائے ہوئے فلمی گیت اس کے دل پر دستک دیتے، وہ کمرے میں
گھومنے لگتی، کھڑکی کے قریب جا کر سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کا روشن
تاج دیکھتی۔ جس کے اردگرد پتنگوں کا ایک ہجوم ایک اٹوٹ دائرہ بنائے رکھتا۔
اچانک اس قمقمے سے لالہ مراری لال چھڑی سنبھالے نکلتے اور کسم لپک کر اپنے
پلنگ پر آگرتی۔ گٹھڑی بن کر رہ جاتی۔ گھٹنوں کو سینے سے بھینچتی اور جب ساتھ
کے کمرے میں اس کے پتا کھانستے، باہر سڑک پر نیپالی چوکیدار نیند کی مستی کے
عالم میں لوگوں کو ہوشیار رہنے کے لیے کہتا۔ اور روشندان میں سویا ہوا کبوتر

خواب میں گھلتا تو کسم کا ماحول سانس لینے لگتا۔ خیالوں کے پتنگے اندھیرے کونوں سے چمٹ جاتے' ایک لمحے کے لیے وہ اپنے آپ کو اس قربانی کے لیے تیار پاتی۔ مگر اچانک رات کا سکوت دبے پاؤں آتا اور اس کے کانوں کے قریب سرگوشی کرتا۔

"اب کیا ہوگا؟"

آخری روز وہ دن بھر روتی رہی۔ اس کی ماتا کو کچھ شبہ سا ضرور ہوا۔ کیونکہ سوچ کی سنجیدگی نے اس کے چہرے کی جھریوں کو گہرا کر دیا تھا۔ مگر اب سوچ بچار کا وقت کہاں تھا۔ اب تو گھرانے کی ناک کی فکر تھی' جو کٹنے کے لیے ذرا سا بہانہ چاہتی ہے۔

لالہ مراری لال کے ہاں آکر کسم نے دیکھا کہ لالہ جی کچھ ایسے بھیانک نہیں۔ چہرہ سرخ ہے' اگر اس سرخی میں کہیں کہیں کسی جھری نے جھالر بنا دی ہے' تو کیا۔ جھری آخر انسانوں ہی کے چہرے پر پڑتی ہے نا۔ اور پھر لالہ جی کے مزاج کی رنگینی تو کسم کے مرجھائے ہوئے خیالوں کے لیے ساون کی پھوار ثابت ہوئی۔ چند راتیں تو اس نے رنگ رنگ کی خیالی بہشتیں بسانے میں بسر کیں۔ پھر کچھ راتیں چھت کی کڑیاں اور چلمن کی تیلیاں گنتی رہی۔ ایک دو مرتبہ نصف شب کو خاموشی میں کسی بھجن کے ابتدائی بول بھی گنگنائے' مگر اس کے کمرے کی ویرانی میں کوئی فرق نہ آیا۔

نشست و برخاست میں نئے نئے زاویے اختیار کیے' چلتے ہوئے یوں لچکی' جیسے کہیں سے ٹوٹ جائے گی۔ سانس لینے میں بھی ایک ادا تھی۔ نازک نتھنے یوں پھڑکتے جیسے کسی آوارہ بوند کے گرنے سے پھول کی پتی ہلکی سی پھریری لیتی ہے۔ سینہ یوں ابھرتا جیسے ابھرتا ہی چلا جائے گا' اور جب یہ سیلاب اتر جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے ساری کائنات کہیں دور خلا میں ڈوبی جا رہی ہے۔ آنکھیں

جھپکانے سے پہلے پتلیوں میں نیندیں جھانکتیں اور جھپک کے بعد یہ نیندیں پھیل کر چھٹ جاتیں' جیسے جھاگ کے ہٹ جانے سے سمندر کی تہہ میں پڑی ہوئی سیپی جھلک اٹھتی ہے' انگڑائی یوں لیتی جیسے فضا میں ابھر کر تیرنے لگے گی اور پھر ایک دم باہوں کو یوں چھوڑ دیتی جیسے دو ستارے ایک وقت میں متوازی خطوط بناتے ٹوٹ پڑیں۔

اگر لالہ مراری لال کی ماتا زندہ ہوتیں تو شاید کسم کو رسم و رواج کی بہت سی سولیوں پر لٹکنا پڑتا۔ مگر یہاں تو بالکل کھلا میدان تھا۔ اور کھلے میدان میں اگر ہرنی کسی ٹیلے کی اوٹ میں پڑی رہی' تو لعنت ہے اس کے ہرنی پنے پر' اور تف ہے اس کی ان کلیلوں پر' جن میں جوانی ہے' رقص ہے' آہنگ ہے' دعوت ہے' وہ دعوت جو فوری پذیرائی چاہتی ہے' چاہے یہ پذیرائی شکاری کے تیر کی ہو' صیاد کے دام کی ہو یا ہرن کے اضطراب کی!

لیکن یہاں تو ابتدائی دنوں میں چند مسکراہٹوں کا سودا ہوا اور لالہ مراری لال کی چھٹی ختم ہوگئی۔ اسی پرکار کا چکر شروع ہو گیا جو ہر کلرک کی زندگی کا محور ہے۔ دفتر سے گھر' گھر سے واک پر——اور واک سے واپسی پر فائلوں بھری نیندیں۔ اگر مراری لال جی کسم کو دفتر کی اس گھنٹی کی حیثیت ہی دے دیتے جس کی گردن کو دبا کر اردلی کو بلایا جاتا ہے' تو بھی غنیمت تھا۔ لیکن کسم بے چاری تو یہاں آتے ہی ردی کی ٹوکری بن گئی۔ ہر وقت قدموں میں پڑی رہتی۔ گاہے گاہے چند مٹی مٹی مسکراہٹیں' چند گھسے پٹے قہقہے۔ چند مڑی تڑی باتیں۔ بے رس جمائیوں کی دھجیاں اور بس!

اور پھر لالہ مراری لال ہیڈ کلرک بن گئے' تو اچانک ان کے مزاج کا ایک چھلکا اتر گیا۔ خوش مزاجی سانپ کی کینچلی کی طرح اتر گئی۔ اب لالہ مراری لال دفتر کے فرعون تھے۔ ظاہری آن بان میں بھی تبدیلی نمایاں ہوگئی۔ جھکی

ہوئی مونچھوں نے ننھی سی انگڑائیاں لیں۔ داڑھی ہفتے میں دو مرتبہ کی بجائے
بلاناغہ صاف کی جانے لگی۔ گول مول پگڑی میں ننھی سے کلغی بھی ابھر آئی۔
کسم کی امید بندھی۔ پھر وہی خیالی جنتیں بسنے لگی۔ لیکن ان جنتوں میں کوئی نہ
آیا۔ لالہ مراری لال دفتر سے آکر کسم کے سامنے بالکل سیدھے سادھے مراری
لال بن کر رہ جاتے۔

کسم نے جب دیکھا کہ گھسی ہوئی چول ہے۔ کھاٹ کو مقررہ زاویے پر
جمانا ہوگا' تو چول کی درزیں بھرنے لگیں۔ ایک بار لالہ جی کے بوٹ اتارتے
ہوئے ان کی پنڈلی کے بال کھینچ لیے۔ مگر مراری لال ہڑبڑا کر پیچھے ہٹے تو آرام
کرسی کا ٹاٹ دھڑ سے پھٹ گیا اور لالہ جی قلابازی کھا گئے' اٹھے تو گردن کے
تناؤ میں دیر تک جھول سی پڑی رہی۔ کسم اپنے تجربے کا ایک بھونڈا نتیجہ دیکھ کر
چکرا گئی تھی۔ مگر لالہ جی کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ دیکھ کر ہنس دی۔

لالہ جی بولے۔

"میں سمجھا بھڑ ہے' ٹخنوں میں جا گرا تھا کلیجہ!"

"بڑی کھلی سڑکیں ہیں آپ کے جسم میں!" کسم نے فقرہ کسا۔

لالہ جی کوئی مناسب جواب نہ پا کر یوں بولے' جیسے حلق میں چبھی
ہوئی سوئیاں نکال رہے ہیں۔

"بات یہ ہے کسم کہ میں دو مہینے سے ایک پیٹنٹ دوا استعمال کر رہا
ہوں۔ اسی لیے تو سبزی کے سوا کچھ نہیں کھاتا۔ پرہیز ضروری ہے اور پھر یہ تم
جانتی ہوگی کہ پرہیز کمزور کر دیتا ہے۔"

اچانک حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی' اور لالہ امیرچند دستک کے
جواب کا انتظار کیے بغیر اندر گھسے چلے آئے۔ وہ اس سے پہلے بھی یونہی آتے
رہتے تھے۔ اور جس روز انہوں نے ننگے پاؤں پھرتی ہوئی کسم کی ایڑیوں پر

ہاتھی دانت کی گیندوں کی پھبتی کسی تھی تو کسم نے ان کی آنکھوں میں کئی
زبانوں کو تڑپتے دیکھ لیا تھا' اسی لیے لالہ امیرچند اسے اچھے نہیں لگتے۔ آج
جب انہوں نے دیکھا کہ کرسی کا ٹاٹ زمین پر پڑا ہے۔ لالہ جی کی گردن میں خم
اور پیٹھ پر گرد ہے اور کسم کے ہونٹوں پر شرارت کی تھرتھری ہے تو وہ ایک دم
زور سے ہنسے۔ تالی بجا کر بولے۔

"کشتی ہو رہی ہے پتی پتنی کی!"

لالہ مراری لال کی مسکراہٹ نے مزید شہ دی۔ اب امیرچند نے کسم
کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔

"کسم نے پٹخنی دی ہے شاید!"

——اور کسم اندر بھاگ گئی۔ ایک کونے میں سمٹ کر پڑی رہی۔
بھلا یہ بھی کوئی بات ہے' جو حقدار ہے وہ پرہیز کی وجہ سے چھوئے تک نہیں
اور جو تماشائی ہے وہ دونوں ہاتھوں سے ہڑپ کرنے پر تل جائے۔ لالہ مراری
لال اندر آئے۔ کسم کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر رکے۔ تیوری چڑھا کر دہلیز پر ٹھٹکے
ہوئے امیرچند کی آنکھوں میں دے ماری' اور کسم سے بولے۔

"آخر ایسا بھی کیا——"

امیرچند پلٹ گئے تو کسم سسکیاں بھرنے لگی۔

"لالہ امیرچند یہاں نہ آیا کریں—— بس—— ہاں—— ابھی
پچھلے دنوں مجھ پر پھبتی کسی تھی۔ آج آکر لتے لے ڈالے میری لاج کے——
دوست ہیں تو پڑے ہوا کریں—— ہاں!"

اور لالہ مراری لال چپکے سے باہر کھسک آئے' امیرچند سے کھسر پھسر
کی۔ اس کے شانے کو تھپتھپایا' ہاتھ جوڑے اور اس کے بعد لالہ امیرچند اندر
کبھی نہ آئے۔ بس باہر ہی سے پکار دیتے "مراری! چلو واک پر چلیں۔" اور پھر

ایک دو بار یوں کھانستے جیسے حلق سے چمٹے ہوئے تنکے کو اچٹنا چاہتے ہوں۔

کسم اکثر سوچتی کہ اگر مراری لال کو محض کسی بھوجن تیار کرنے والی کی ضرورت تھی تو ان گنت نوکرانیاں مل سکتی ہیں۔ آخر کسم کو بندھن میں جکڑ کر اس سے محض روٹی پکوانے کا کام لینا تو سفاکی ہے۔ شادی بیاہ کے بعد کی باتوں پر اسے کافی عبور حاصل تھا کیونکہ اس کی کئی سکھیاں اس کے سامنے ہی بیاہی گئی تھیں۔ اور پھر انہوں نے کسم کو بتایا تھا کہ کنوارپنے کی جوانی تو تالاب کے پانی پر کائی کی حیثیت رکھتی ہے' کنول تو جا کر کھلتے ہیں پتی کے گھر میں۔ وہ کنول جو کبھی نہیں مرجھاتے۔ یہاں کسم بڑے بڑے کنولوں کی امیدیں لے کر آئی تھی' مگر جب اس نے دیکھا کہ تالاب کا پانی ہی سوکھ چکا ہے' موئے کنول کہاں اگیں گے' تو اسے ہر طرف تھوہر کے ظالم کانٹوں کا احساس ہونے لگا۔ ان کانٹوں سے بچ کر نکل جانے کی اس نے کئی ترکیبیں سوچیں۔ رامائن کو رٹ ڈالا۔ چند بوڑھی پڑوسنوں سے ہمالہ کی چوٹیوں پر بسنے والے بیراگیوں کی کہانیاں سنیں جنہوں نے جوانیوں کو تج کر برف سے آگ سینکی اور آگ سے امرت نکالا۔ لالہ امیر چند کی بیٹی ہیم لتا سے تو اس کا بہناپا سا ہو گیا۔ اور جب اس نے یہ سنا کہ ہیم لتا کی ماں کب کی سورگباش ہو چکی ہے تو اس کے دل میں لالہ امیر چند سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

"لتا ـــــ عمر کیا ہے تمہارے پتا کی؟" ایک دن پوچھ بیٹھی۔

لتا کچھ سوچ کر بولی۔

"دکھوں نے بوڑھا کر دیا ہے' ورنہ عمر تو یہی کوئی بیالیس چوالیس کے لگ بھگ ہو گی!"

کسم بولی "عمر تو کچھ زیادہ نہیں۔"

اور طوطا پنجرے کی ایک سلاخ کو چونچ سے کھرچ کر بولا۔

"وارے نیارے' وارے نیارے۔"

لتا ہنس پڑی۔

اور کسم آنکھیں جھپکانے لگی۔

لالہ مراری لال کچھ اداس اداس رہنے لگے' کیونکہ لالہ امیر چند واک پر نہیں جاتے تھے اور اکیلے واک پر جانا تو کچھ ایسا ہے' جیسے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ناچتے پھرنا۔ پچھلے چند دنوں سے لالہ امیر چند کو روحانی تھکن کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا اور چونکہ لالہ مراری لال کو اس مرض کا خاصہ تجربہ تھا اور وہ خود ایک برس سے پیٹنٹ دوائیں استعمال کر رہے تھے اس لیے کئی مفید مشورے دیئے اور کہا۔

"ایک بار استعمال کرو اور پھر دیکھو کیسے اینٹھن سی ہوتی ہے رگوں میں۔ پر ہاں زیادہ خوراک نہ لینا۔ رات کو نیند نہیں آئے گی۔ بوتل پر سب ہدایات لکھی ہوتی ہیں۔ کہو تو لیتا آؤں؟"

اور لالہ امیر چند جواب دیتے۔

"دیکھیں گے' ابھی تو میں آسانند وید کی ایک دوا استعمال کر رہا ہوں' جو بندھیاچل کی جڑی بوٹیوں کے ست سے تیار ہوئی ہے۔"

لالہ مراری لال کو واک پر جانے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تھی اور وہ انہیں لالہ امیر چند کے بوڑھے بہنوئی کی صورت میں مل گیا۔ ان کا نام اوی ناش تھا۔ وہ ایک عرصے سے ہردوار میں مقیم تھے۔ ان کا اصلی نام رام دیا تھا۔ مگر ہردوار والوں نے کہا کہ اس نام میں پنجابیت ہے' اس لیے اسے بدل دینا چاہئے۔ وہ یہاں تین مہینے کی چھٹی پر آئے تھے۔ چھٹی لے کر پہاڑوں پر جانا تو ناممکن ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جب چھٹی کا مقصد

اچھی صحت حاصل کرنا ہے اور یہ صحت پہاڑوں کی پاکیزہ ہواؤں کے علاوہ مفت کی پر تکلف دعوتوں میں بھی مل سکتی ہے تو اتنے اسراف سے فائدہ! ہواؤں سے پھیپھڑے بھرے جاتے ہیں' دعوتوں سے توندیں ٹھونسی جاتی ہیں۔ اور پیٹ بہرحال پھیپھڑوں سے زیادہ توجہ کے لائق ہے۔ وہ بلا کے چٹورے واقع ہوئے تھے۔ ہیم لتا بے چاری ہر وقت رسوئی میں پڑی رہتی اور پھوپھا کی خاطر مدارت میں کوئی فرق نہ آنے دیتی۔ اول تو اسے خود بھی پھوپھا سے انس تھا کیونکہ وہ اسکے لیے ہردوار سے قسم قسم کے تحفے لائے تھے۔ دوسرا لالہ امیرچند کی سخت تاکید تھی کہ ہیم لتا کہیں باہر نہ جائے' حتیٰ کہ کسم کے ہاں بھی کم جائے۔ مبادا لالہ اوی ناش بے توجہی کا گلہ کر بیٹھیں اور ناک کٹ کر وہ جا گرے۔

لالہ مراری لال دفتر سے آتے۔ کسم سے دو چار باتیں کرتے اور پھر اوی ناش کو ہمراہ لے کر واک پر نکل جاتے۔ لالہ امیرچند نے دکان کو اپنے نائب کے حوالے کر دیا تھا۔ سارا دن کھاٹ پر پڑے رہتے۔ پانچ بجے کے بعد چھت پر چلے جاتے اور دیر تک وہیں ٹہلتے رہتے۔ ہیم لتا نیچے رسوئی میں شام کا کھانا تیار کرتی رہتی۔ اندھیری شاموں کو جب لالہ جی چھت سے اترتے تو اگرچہ ان کے مزاج کی تھکن بدستور ہوتی' مگر ان کے چہرے میں سرخی سی ضرور جھلکتی' جسے ہیم لتا نے بلندی کی صاف ہوا کا اثر سمجھا تھا' اور دوپہر سے ہی پتا جی سے جھگڑا شروع کر دیتی۔

"آپ چھت پر جائیے نا' جب تک دھوپ ہے' برساتی میں پلنگ پر پڑے رہتے ہیں شاید' مجھے آپ کے قدموں کی چاپ تو سنائی نہیں دیتی۔ چھت کی ہوا سے آپ کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑا ہے۔"

لالہ اوی ناش اور مراری لال واک پر واپس آتے' تو دیر تک گپیں ہانکی جاتیں' اور پھر لالہ مراری لال گھر جاتے ہوئے امیرچند کو نئی نئی دواؤں کے

نام بتاتے۔ گھر آ کر وہ ایک چکر میں پڑ جاتے۔ انہیں کسم کی چہلیں پسند تو تھیں' مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر چہلوں کا طوفان ایکدم سے کیسے ابل پڑا۔ اب نہ وہ لالہ جی کے بوٹ اتارتی نہ ان سے کوئی مذاق کرتی۔ نہ ان کی پنڈلیوں کے بال کھینچتی۔ اپنے پلنگ پر پڑی گنگناتی رہتی۔

"سکھی پی کا ملن کیسے ہوئی ری!"

اور جب وہ یہ بول گاتی:

"چوریاں پھوروں مانگ بکھیروں
کجرا ڈاروں دھوئی ری!
سکھی پی کا ملن کیسے ہوئی ری!

تو لالہ جی پکار اٹھتے۔

"کسم!"

کسم محض گردن موڑ کر پوچھتی۔

"جی۔"

"ایسے بھجن نہ گایا کرو!"

"یہ بھجن نہیں گیت ہے۔"

"ایسے گیت نہ گایا کرو۔"

"کیوں جی!"

"جو بول بار بار منہ سے نکلیں' وہ پورے ہو کے رہتے ہیں۔"

اور کسم زور زور سے ہنستی۔

"آپ عجیب بھولی باتیں کرتے ہیں' آپ تو بالکل بچے ہیں!"

لالہ جی کی گھبراہٹ اور حیرت دیکھ کر وہ انگڑائی لے کر اٹھتی۔ پاؤں لٹکا کر دیر تک ٹانگیں ہلاتی رہتی۔ سلیپر پہن کر' سج سج قدم اٹھاتی اور کافی دیر

کے بعد لالہ جی کے سامنے ایک تھال آتا۔

لالہ جی سوچتے اور کھاتے' کھاتے اور سوچتے۔ اور چونکہ ویدوں کے قول کے مطابق کھاتے ہوئے سوچا جائے تو کھانا ہضم نہیں ہوتا اس لیے لالہ جی کا معدہ بھاری رہنے لگا۔ اور اس کا ایک ہی علاج تجویز ہوا ——— واکیں اور لمبی کر دی گئیں۔

اوی ناش نے نہایت تندہی سے لالہ مراری کا ساتھ دیا۔ اتنی لمبی واکیں ہوئیں کہ موٹروں والے بھی ہار جائیں۔ لالہ امیر چند چھت پر ٹہلتے رہتے۔ ہیم لتا کو رسوئی نے باندھ رکھا تھا۔ وہ بے چاری کبھی دن ڈھلے کسم کے ہاں چلی جاتی۔ دونوں طوطے کو چھیڑتیں۔ لالہ اوی ناش کی ننھی سی توند پر نئی نئی پھبتیاں سوچی جاتیں۔ لالہ امیر چند کے عجیب و غریب مرض کے متعلق فکر کا اظہار کیا جاتا اور ہیم لتا کہتی ——— !

"کسم سچ کہتا ہے تیرا طوطا۔ تیرے تو وارے نیارے ہیں۔ تو جس ڈھنگ سے جیون بتا رہی ہے وہ میرے لیکھ میں ہو تو بھگوان جو کہے کرنے پر تیار ہوں۔ تو دن بھر آرام سے کھاٹ پر پڑی رہتی ہے' لالہ جی کے لیے دو پھلکے تیار کر لیے۔ کوئی سبزی بھون کر رکھ لی اور بس! مجھے دیکھ رسوئی میں پڑی سڑتی ہوں۔ ادھر پتا جی کی چتا کھائے جا رہی ہے۔ جانے کیا ہو گیا ہے انہیں' گھر سے نکلتے ہیں تو کہتی ہوں "ہے ایشور' انہیں کسی تانگے موٹر کی جھپٹ سے بچائیو۔ پہلے چھت پر جاتے تھے۔ اب باہر گلیوں میں بھی گھومتے رہتے ہیں۔ آخر بیچارے کیا کریں۔ واک کی پرانی عادت ہے نا۔"

اور جب لالہ اوی ناش کی تین مہینے کی چھٹی ختم ہو گئی اور وہ ہردوار چلے گئے تو لالہ مراری لال نے لالہ امیر چند سے کہا۔

"ارے بھئی رہنے بھی دو' میں تو کہتا ہوں تم جوانی میں بھی ایسے لال

سرخ نہ ہو گے جتنے آجکل ہو' یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے تم نے۔ چلو میرے ساتھ' واک کریں گے' تو اور نکھرے گی تمہاری صحت ———"

بڑی ردوکد کے بعد لالہ امیر چند رضا مند ہوئے' اور اب پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب وہ دروازے تک آکر پکارتے "چلو واک پر چلیں مراری ———" تو کبھی کبھی لالہ مراری لال کسم سے پوچھتے۔

"کسم! ضد کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ لالہ امیر چند میرے اتنے اچھے متر ہیں اور یوں باہر سے صدائیں لگاتے پھریں۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔ کیا حرج ہے اگر وہ آجایا کریں اندر!"

"نہیں جی!" کسم کہتی۔

"کیوں؟"

"بس!"

"آخر کوئی وجہ؟"

"بس ——— ہم نہیں چاہتے ——— ہاں!" اور پھر نچلا بھرا بھرا ہونٹ لٹکا کر کہتی "ہماری مرضی۔"

یہ بہار کے آغاز کی بات ہے۔ لالہ اوی ناش کو ہردوار گئے کوئی سات آٹھ مہینے گزرے ہوں گے' لالہ مراری لال کی زندگی اسی محور پر گھوم رہی تھی کہ ایک روز اچانک روڑا اٹک گیا۔ لالہ مراری لال ایک بوڑھی پڑوسن کی زبانی یہ سن کر بھونچکا سے رہ گئے کہ کسم کی گود ہری ہونے والی ہے۔

بہار کی ابتداء گھسے پھٹے بچے کھچے ارمانوں میں ایک اضطراب سا بھر دیتی ہے۔ اور پھر لالہ مراری تو ایک مدت سے پیٹنٹ دوائیں استعمال کر رہے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ بہار جب شباب پر آئے گی تو پتنی کے تمام حقوق کی نگرانی شروع کر دیں گے۔ مگر اب تو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا تھا۔ شادی کے بعد کا سوال نئے

نئے رنگوں میں ان کے سامنے آیا۔ مگر یہ ہمیشہ کی طرح ہموار تھا۔ کہیں کہیں کسم کے غیر معمولی ناز اور غمزے اس خط مستقیم میں منحنی سی دھڑکنیں پیدا کر دیتے تھے، ورنہ کوئی فکر کی بات نہ تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر پتنی کو محض چھو لینے سے اس کی گود ہری ہو جاتی ہے، تو جنگ کے زمانے میں جرمنی اور اٹلی کی دواؤں پر اتنے اسراف کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کسم کے بارے میں گھنٹوں سوچتے رہے۔ اس روز کسم کو بڑے غور سے دیکھا مگر اس کے چہرے پر خوف و ہراس یا ندامت کا ہلکا سا عکس بھی نہ تھا۔ وہ سوچتے کہ شاید بھولے سے —— کبھی کسی بھیگی رات کے سناٹے میں ——! مگر یہ ناممکن تھا —— انہیں اپنی یادداشت پر ناز تھا۔ ہیڈ کلرک بننے میں ان کی زبردست یادداشت کا بھی بہت کچھ دخل تھا۔ اور پھر اس نوع کے واقعات تو ان کے ذہن میں پوری جزوی تفصیلات کے ساتھ محفوظ رہتے تھے کیونکہ آخر مستقبل کی تاریخ انہی واقعات سے تو مرتب ہوا کرتی ہے۔

چند روز کے بعد دفتر میں ان کی میز پر فائلوں کا ایک انبار سا لگ گیا۔ ماتھے کی ہڈی ہر وقت تپی ہوئی ٹھیکری بنی رہتی۔ ضروری کاغذات پر قلم کی بجائے پنسل سے دستخط کر بیٹھتے اور پھر بگڑ کر اسے ربڑ سے مٹاتے تو کاغذ پھٹ جاتا۔ چٹھی کو نئے سرے سے ٹائپ کرانے کے لیے کلرک کو بلاتے تو کہتے۔

"ذرا کھلا کھلا ٹائپ کرو، کاغذ ضائع ہوتا ہے، تو ہونے دو۔ ہمیں کسی کی پروا نہیں ——!"

وہ جانتے تھے کہ شادی کے بعد بچے پیدا ہوتے ہی ہیں۔ شادی اکثر اسی غرض سے کی جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش بیاہے جوڑے کی سب سے بڑی کامیابی اور مسرت ہے لیکن محل نظر تو یہ بات تھی کہ لالہ مراری لال کے پرہیز کی مدت ابھی ختم ہی نہیں ہوئی تھی، اور بچہ آپ ہی آپ آ نکلا۔

اندیشوں کا ایک طوفان تھا جو ان کے دماغ میں نت نئے دھماکے پیدا کرتا۔ کئی بار تو وہ اس حد تک سوچتے کہ بچے کو مار دینے کی تجویزوں پر غور کرنے لگتے۔ مگر پھر جی میں کہتے، شبہے کی تو گنجائش ہی نہیں، شادی کے بعد ایسا ہوتا ہی ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں، یہ سوا سال بھی ذرا لمبی مدت ہے، اس سے پہلے ہو جانا چاہیے تھا یہ واقعہ —— مگر واقعہ تھا بڑا ٹیڑھا۔

وہ کسم یا کم از کم امیر چند سے اپنی اس فکر کا ذکر کرنے کے لیے بیقرار ہو جاتے۔ لیکن کسم سے بات کرتے جھجکتے، مبادا وہ شور مچا دے اور اچھا بھلا بچہ پرایا ہو کر رہ جائے۔ جوانی میں جو انہوں نے کوک شاستر پڑھا تھا۔ وہ یہی کہتا تھا کہ عورت سے سوچ سمجھ کر بات کرو، ورنہ وہ بگڑ گئی تو سنبھالے نہ سنبھلے گی۔

لالہ امیر چند سے اس کا ذکر اس لیے نہ کرتے کہ وہ فوراً ایک عظیم الشان فیسٹ کا مطالبہ کریں گے —— ان کے لیے تو تعجب کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔

اور پھر ایک روز کسی بے تار برقی کے ذریعے کسم کی ماتا آ نکلیں، اور پڑوسنوں کا تانتا بندھ گیا۔

"آپ آج چھٹی لے لیجیے۔"

کسم کی ماتا نے کسی مصلحت کی وجہ سے کہا تھا۔ اور وہ سوچنے لگے تھے۔ "آخر کسی کا نوکر تھوڑا ہوں، کسم نے مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ سارا معاملہ خود بخود نمٹائے جاتی ہے، اگر ایسی ہی غیریت ہے تو مجھے کیا پروا۔ میں دفتر جاؤں گا۔" اور وہ سچ مچ دفتر چلے گئے۔

مگر ابھی چار بجنے میں نو منٹ باقی تھے کہ ان کے کمرے کے باہر ایک شور سا بلند ہوا، اور پھر لالہ امیر چند کی آواز آئی۔

"نکلو بھئی دفتر سے، سامنے آؤ اور فیسٹ کی رقم سیدھے ہاتھ سے رکھ

دو۔"

ان کے احباب کا انبوہ کمرے میں گھس آیا۔

کلرکوں کی شریر مسکراہٹیں کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر چمٹی ہوئی تھیں۔ اور سارے دفتر میں ایک گونج سی چکر کاٹ رہی تھی۔

لالہ امیر چند آگے بڑھ کر بولے۔

"اچھا تو آپ اپنے کارنامے چھپائے رکھتے ہیں ہم سے۔"

لالہ مراری لال نے سوچا' جو ہونا تھا ہوچکا۔ اب جی برا کرنے سے فائدہ! سنبھل کر بات کرو ـــــ مسکراؤ ـــــ یہ بھگوان کی دین ہے' قبول کرو اسے' شاباش!

ضمیر کی چٹکیوں سے بے پروا ہو کر انہوں نے کہا۔

"ایسی باتوں کے اشتہار تو لگائے نہیں جاتے۔"

لالہ امیر چند بولے۔

"اچھا تو نیسٹ کی بات کرو۔"

لالہ مراری لال نے مسکرا کر کہا۔

"ہوگی اور دھڑلّے سے ہوگی ـــــ!"

اور پھر دفتر سے نکل کر انہوں نے گھر کی راہ لی۔ سارے احباب ہمراہ تھے۔ راستے میں لالہ مراری لال نے ایک راز کا انکشاف کیا۔

"نیسٹ سے مجھے پہلے بھی کوئی انکار نہ تھا۔ مگر اب تو ہمیں مہنگائی الاؤنس ملا کرے گا۔ پچھلے چھ مہینوں کا الاؤنس بھی اب کے اکٹھا مل جائے گا ـــــ فکر کی بات نہیں۔"

حویلی کے دروازے پر لالہ امیر چند بولے۔

"سنا ہے بھابی بچے کا نام خود ہی چنے گی۔ کسی پنڈت ونڈت کی

ضرورت ہی نہیں سمجھی' سنا ہے کبیر چند نام ہوگا ہمارے بھتیجے کا' مگر مراری! یہ کبیر تو عربی لفظ معلوم ہوتا ہے۔"

کواڑ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے ایک لالہ جی بھوری مونچھوں میں سے بولے۔

"تو بھئی یہ امیر ہماری بھاشا ہی کا لفظ ہوگا۔ ہے نا ـــــ یہ بھی تو مسلمانوں ہی کی گھڑنت ہے۔"

اور لالہ مراری لال سوچنے لگے:

"آخر بچے کا نام گردھاری لال یا سرداری لال کیوں نہ ہو' گردھاری یا سرداری' اور مراری ـــــ اور یہ کبیر اور ـــــ

انہوں نے گھبرا کر سامنے دیکھا اور اچانک اندر سے طوطا پکارا۔

"وارے نیارے' وارے نیارے!"

سانولا

چوڑے چکلے صاف صاف پتھروں پر دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے دہقان حقے کا انتظار کر رہے تھے اور احمد بیگ کے دیو پیکر بیل کی اچانک موت کا موضوع ختم ہو چکا تھا۔ جعفر میرے گھٹنے کو تھپتھپا کر ہولے سے بولا۔

"اب لطف آئے گا' ہمارے بھائی حقہ پی کر ہی موج میں آتے ہیں۔"

اور سچ مچ جب سرحدی حقے سے نکلے ہوئے گاڑھے دھوئیں کے بونبے ادھر ادھر لڑکھڑانے لگے تو دہقانوں نے پینترے بدلے۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب سی لذت آمیز بے چینی پھیل گئی' جیسے منتظر ہیں اور انتظار سوہانِ روح ہے۔

ایک بولا۔

"بھئی تمباکو میں پانی کم ٹپکایا کرو' پھسپھسا ہو جاتا ہے ——— دھوئیں میں جان نہیں رہتی۔"

دوسرے نے پلٹ کر دیوار پر تھوکتے ہوئے کہا۔

"ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔"

تیسرا اپنی لٹھ کا زاویہ بدل کر بولا۔

"وہ ——— سوکھا تمباکو بھی کیا جیسے کوئی بے گھی کی دال کھا لے!"

"سانولے کی طرح۔" جعفر نے کہا' اور پھر میرے کان میں بولا "اب دیکھنا۔"

"بالکل۔" ایک بوڑھا تنکے سے ایک مکوڑے کو چھیڑنے لگا۔ "بالکل سانولے کی طرح' مجھے بھی بے گھی کی دال یاد آئے تو ساتھ ہی سانولا بھی یاد آجاتا ہے!"

"سانولا؟" میں نے کہا۔ "بھئی خوب نام ہے!"

جعفر کے والد تکیے کو کہنی کے نیچے سے نکال کر بغل میں جماتے ہوئے بولے۔

"کام دیکھو سانولے کے تو نام بھول جاؤ۔ جعفر نے ابھی تک اپنے دوست کو سانولے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ان دو تین مہینوں میں؟ ہمارے گاؤں میں سانولا ہی تو ہے دیکھنے کی چیز' ڈپٹی صاحب تصویر اتار کر لے گئے تھے۔ کہتے تھے لندن کے اخبار میں چھپے گی' انعام ملے گا۔"

"کسے؟" ایک آواز آئی۔

"ڈپٹی صاحب کو' اور کسے!" جعفر کے والد صاحب کا تکیہ بغل سے نکل کر گھٹنے تلے آ رہا تھا۔

"ایک کتا خرید لیا ہوگا' انعام لے کر۔" جعفر ہندوستان کی انقلابی تحریک سے بہت متاثر تھے اس لیے کبھی کبھی جوش میں آکر ان دہقانوں سے سیاسیات کی انگریزی اصطلاحوں میں بھی باتیں کرنے لگتا تھا۔ اب وہ بھی سنبھل بیٹھا' جیسے ہوا میں کسی پر جھپٹنے والا ہے۔ "کتا' یا کتاب' یا کموڈ!"

"یہ ایک قسم کی ———" جعفر کموڈ کی تفصیلات میں جانے لگا تھا۔ میں نے ٹھوکا مار کر اسے روکا۔ وہ بولا۔

"یہ ایک قسم کی کرسی ہوتی ہے' بیٹھتے ہیں اس پر۔"

"آج ہی سنا ہے یہ کرسی کا نیا نام۔" وہ بزرگ ہونٹوں پر پھڑپھڑاتی ہوئی مسکراہٹ لیے پھر پتھر پر بکھر گئے۔

جعفر کے والد کا تکیہ بغل سے نکل کر گھٹنوں تلے آگیا تھا۔ وہ شاید کموڈ کا مطلب سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ایک دبی دبی طنز ہونٹوں کی لرزش میں ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ ہنسی کو کھانسی میں بدل کر بولے۔

"بڑے شریر ہوتے ہیں' یہ پڑھے لکھے۔ بات کا بتنگڑ اور بتنگڑ کی بات بنانا چاہو تو ان سے سیکھو' مینڈکیاں چیرتے رہے ہیں اسکولوں میں۔ جن دنوں جعفر کی ماں' خدا بخشے' بیمار تھی تو ایک رات اس کی پسلیوں میں بڑا سخت درد اٹھا۔ جعفر میاں نے کئی اوٹ پٹانگ باتیں بتائیں پسلیوں کے بارے میں۔ میں نے پوچھا۔ تم کیا جانو اندر کا حال —— بولا۔ ہم نے مینڈک چیرے ہیں۔ مینڈک اور انسان کی قسم ایک ہے۔"

دہقان بغلیں جھانکنے لگا اور پھر ایک ساتھ قہقہے لگانے لگا۔ جعفر کھسیانہ ہو کر بولا۔

"بھئی تم نہ سمجھو تو میں کیا کروں' یہاں کوئی لیبارٹری ہوتی تو —— "

"یہ لاٹری بھی کسی کرسی ہی کا نام ہوگا ——" پتھر پر بکھرے ہوئے بزرگ بولے۔

اور جعفر بھنا گیا۔

"جی ہاں! یہ بھی کرسی ہی کا نام ہے جس پر تمہاری ——"

میں نے اسے روک لیا۔ جعفر کے والد اٹھ بیٹھے۔ "ارے میاں مذاق کرتے ہو تو سہا بھی کرو —— بیوقوف۔" اور جعفر مجھے ہاتھ سے کھینچ کر مجمع

میں سے اٹھا لایا۔

میں نے جعفر کو مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی کی نصیحت کرنا چاہی' مگر وہ بولا۔

"جانتا ہوں بھئی' جانتا ہوں' تم تو ہوئے شہری۔ میں یہیں پیدا ہوا۔ یہیں رہا۔ جانتا ہوں سب کو۔ مذاق کرتا بھی ہوں' سہتا بھی ہوں۔ البتہ یہ بوڑھا جو پھیلا ہوا تھا پتھر پر' اس کا ٹینٹوا دباؤں گا کبھی۔ جوانوں کی طرح بات بات پر پھبتی کسنے کا شوق ہے کم بخت کو۔ نو لڑکے ہیں اس کے نو! سب فوج میں ہیں۔ اور جو دسواں ہے وہ بھی فوجی معلوم ہوتا ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"اس کی بیوی کے پیٹ میں!"

"فوجی کیسے ہوا؟"

"بوڑھے میاں ابھی سے اس کے لیے نقلی بندوق' ہوائی جہاز' اور ٹینک جمع کرتے پھرتے ہیں۔ پرسوں جیب میں ایک مشین گن ڈال رکھی تھی —— اور ابھی چھٹا مہینہ ہے۔ بچوں کے کھلونے ہوتے ہیں جھنجھنے یا پتنگ یا لٹو —— ارے ہاں۔ وہ سانولے کا نام سنا تھا نا تم نے؟"

میں بے چین ہو گیا۔

"بھئی اس کے بارے میں کچھ بتانا۔ خدا کے لیے —— تمہارے والد نے تو یوں بات کی تھی' جیسے میں نے سانولے کو نہ دیکھا تو سمجھو کچھ نہ دیکھا۔"

جعفر مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا اور بتایا کہ اس کے والد نے بالکل ٹھیک کہا تھا ——" مجھے بھی لٹو سے یاد آیا —— بالکل بوڑھا ہے وہ۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ' سر گنجا' کناروں پر اکا دکا سفید بالوں کی جھالر۔ جب دیکھو جب ہی لٹو گھماتا نظر آئے گا۔ کوئی لٹو چرا لے اس کا' تو وہ وہ گالیاں تولتا ہے کہ شیطان

پناہ مانگے۔ ادھر لٹو چلاتا ہے' ادھر لوری گاتا ہے۔

سو جا رے ننھے
سو جا رے پگلے
رات ہوئی اندھیاری
اور!
میا کو بھول بھی
ہنڈولے میں جھول بھی
میا گئی بے چاری!"

اس کے بعد جعفر نے مجھے سانولے کی ساری کہانی سنائی۔ وہ اس گاؤں کا ایک عام قسم کا دہقان تھا۔ اور چونکہ عام قسم کا تھا اس لیے اس خاص بات کی توفیق نہ تھی جو انسانی زندگی کی کہانی کا نقطۂ عروج سمجھی جاتی ہے۔ شادی کے لیے اول تو رقم چاہیئے تھی اور دوسرے شخصیت ——— لیکن اس کے باپ کی طویل علالت اور پھر موت نے رقم نہ جمع ہونے دی' اور اس طرح غریبی نے شخصیت پر خاک ڈال دی۔ اتنا بڑا گرانڈیل جوان برسوں ایک بیوی کی تلاش میں بھٹکتا پھرا۔ لیکن بیچارے نے ہر جگہ منہ کی کھائی۔ گاؤں میں یہ خیال عام تھا کہ سانولے کا باپ سکندر آباد سے جو ہٹی کٹی کالی کلوٹی عورت بیاہ لایا تھا اور جس کے لیے اس نے دالان کے اردگرد چار دیواری کھڑی کر دی تھی' نسلاً چمارن تھی۔ اس لیے کون اپنی لڑکی کو چمارن کے بیٹے کے پلے باندھتا۔ سانولے نے ایک دفعہ سکندر آباد جا کر اپنی ماں کے خاندان کا پتہ لگانے کا ارادہ بھی کیا' لیکن اتنے لمبے سفر کو بے سود سمجھ کر اس نے علاقے کے دور دراز دیہات میں کوشش شروع کر دی۔

کہتے ہیں کہ وہ ایک فصل کی کٹائی کے بعد کہیں پردیس چلا گیا اور مدت

تک واپس نہ آیا۔ اس کے مکان کے دالان میں جگہ جگہ گھاس اگ آئی۔ دروازے پر مکڑیوں کے بے ڈھنگے جالے تن گئے۔ منڈیر پر اوندھی پڑی ہوئی سیاہ بھنگ ہانڈی کسی شریر بچے کے نشانے سے ٹوٹ گئی۔ ایک مرتبہ گاؤں کے چند نوجوانوں نے ایک جوڑے کو سانولے کے چھپر تلے سے پکڑ لیا۔ لیکن عورت نے ان حملہ آوروں سے کئی چکنے چپڑے وعدے کئے' مرد نے سرمایہ بانٹنے کا عہد کیا۔ چھپر مرکز ثقل مقرر ہوا' اور ان دونوں کو چھٹی مل گئی۔

مگر ایسی باتیں شاہی محلوں میں نہ سما سکیں۔ یہ تو بے چارے بن باسی سانولے کا پرانا چھپر تھا جس میں بارش کے طرار جھالوں نے جگہ جگہ جھول ڈال دی تھی۔ سارے گاؤں میں اس سودے کے چرچے ہونے لگے۔ جو لوگ رات کے حملہ آوروں میں شامل نہ تھے' وہ دوسری رات کو شام ڈھلتے ہی ہولے ہولے قدم اٹھاتے سانولے کے مکان کے پاس آئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دالان میں پیلی پیلی روشنی اونگھ رہی ہے۔ جھینگر چلا رہے ہیں۔ جیسے انہیں نوواردوں کے اس جارحانہ حملے سے نفرت ہے' کھسر پھسر کی آواز بھی آرہی ہے اور ساتھ ہی کبھی کبھی کڑے سے کڑا اور چوڑیوں سے چوڑیاں بھی بج اٹھتی ہیں۔

اس ماحول میں صبر سے کام لینا دشوار ہو گیا۔

اصل میں جذبۂ غیرت کی بجائے ان لوگوں کے ذہنوں میں جذبۂ حسد ہلچل مچا رہا تھا۔ رکے ہوئے سیلاب کی طرح گڑگڑاتے ہوئے دالان میں آ گئے۔ اور دیئے کی روشنی میں بیٹھے ہوئے جوڑے پر جھپٹنے ہی والے تھے کہ کھاٹ سے سانولا اترا۔ اور ان کے قریب آکر بولا۔

"اصل میں چپ چاپ آنے میں بڑا مزہ ہے۔ میں نے کہا۔ یوں گھر پہنچو کہ صبح کو جب میرے گاؤں والے مجھے مزے سے' اپنی بیوی کے ساتھ

کھیتوں پر جاتے دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ کس نے بتایا تمہیں؟"

سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے۔

چوکیدار کی لٹھ جو زاویہ قائمہ کی صورت میں زمین پر گڑی ہوئی تھی' زاویہ حادہ بنا کر جھک گئی۔ عقب میں کھڑے ہوئے لوگ کھسک گئے۔ چند نوجوانوں نے سانولے کی شادی پر رسما" خوشی کا اظہار کیا ور اسے مبارکباد دیتے جب گلی میں آئے تو چوکیدار نے سب کے دلوں میں ایک تیر سا گاڑ دیا۔

"کہیں سے بھگا لایا ہے۔" اس نے لٹھ کو دیوار سے لگا کر کہا۔

"ورنہ بھئی چمارن کے لڑکے کو داماد کون بنائے گا۔"

"کوئی چمارن ہی ہوگی۔" کوئی دل جلا بولا۔

اور چوکیدار نے مونچھوں کے انبار کو ہٹا کر ہونٹوں کے نم آلود گوشوں کو پونچھا۔ "بھئی میں نے دیئے کی روشنی میں ایک بار اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اگر چمارنیں ایسی ہی ہوتیں ہیں تو دوزخ میں گئیں شہزادیاں' چاند کی ٹکڑی کیا چیز ہے—— مجھے تو بھئی شک پڑتا ہے۔"

بھلا گاؤں کے اتنے بڑے سرکردہ حاکم کے دل میں شک پیدا ہو اور دوسرے گاؤں والے اس کھد بد سے محروم رہیں! رات کی رات گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ ڈومنیوں کو پتہ چلا تو ڈھولکیوں کی رسیاں کس لیں اور پو پھٹتے ہی دھا جوکڑی مچاتی سانولے کے ہاں چلیں۔ ڈھولک کی آواز دعوت عام ثابت ہوئی۔ چھتوں پر بچھی ہوئی کھاٹوں اور چیتھڑوں اور گودڑیوں میں حرکت ہوئی اور آن کی آن میں سرخ اور نیلے لٹھے کی اوڑھنیوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔

سانولا پہلے ہی کسی وجہ سے اداس بیٹھا تھا۔ یہ آوازیں سنیں تو اور سٹپٹایا نئی بیوی ڈھولک کی ٹھیئں ٹھیئں سن کر اندر کوٹھے میں چھپ گئیں۔ سانولے نے وضو کرنے کے بہانے سے کوزہ اٹھایا تو دروازے سے ڈومنیوں کی

سردار بولی۔

"پھر نہالیا میاں۔"

قہقہوں کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ انبوہ کی آخری قطرے نے پوچھا۔

"کیا بات ہے!"

ادھر سے جواب ملا "سو رہے تھے۔"

قہقہوں کا ایک اور فوارہ چھوٹا۔ اور انبوہ کے نقطۂ آغاز پر کھڑی ہوئی ڈومنی بغیر کسی وجہ کے غچ غچ ہنس پڑی اور اپنی ہمجولیوں کو گانے کا اشارہ کیا۔ اس چیخم دھاڑ میں کئی گاؤں والیاں اندر گھس آئیں۔ نوجوان باہر دیواروں سے لگ کر کھڑے تھے کہ کب سانولا باہر نکلے اور اس سے اس میوے کے بازار کا پتہ پوچھیں۔ مگر جو عورت باہر آئی' اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ بڑبڑاتی چلی جا رہی تھی۔

"مجھے تو کچھ شک پڑتا ہے!"

"کنواریوں کے یہ رنگ ڈھنگ——— میں تو کبھی نہ مانوں۔"

"آنکھیں بولتی ہیں۔"

"ڈوپٹے کو ہٹاتی ہی نہیں——— ہٹائے تو بھرم کھل جائے۔"

"کیا بھرم کھل جائے——— کیا راز ہے؟" نوجوان سارسوں کی طرح گردنیں بڑھا بڑھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" ایک نوجوان نے ایک بڑھیا سے پوچھ ہی لیا۔

اور بڑھیا اپنی ناک کو انگشت شہادت سے دوہرا کر کے بولی۔

"کسی جاگیر دار کی نوکرانی اٹھا لایا ہے۔ پڑھی لکھی ہے' پردہ کرائے گا۔"

جاگیردار کی نوکرانی!

پڑھی لکھی!

پردہ!

اور چالیس برس کا ایک ان پڑھ دہقان!

جس کی ماں چمارن تھی اور جس کے باپ کے پیٹ میں کیڑے پڑ گئے تھے۔

نوجوانوں کا شوق بڑھا۔ منتظر رہے کہ دو چار دن کے بعد سانولے کی بیوی گھر سے پانی لانے نکلے تو دیکھیں۔ مگر سانولا خود ہی پانی لانے لگا۔ گھڑا اٹھا کر باہر آیا اور کھٹ سے زنجیر چڑھا دی۔ قصبے سے پوٹلیاں سی باندھ کر لایا اور چھپتا چھپاتا دیوار پھاند کر اندر! کبھی کبھی اسے گاؤں کی تجربہ کار دائی کے گھر بھی جاتے دیکھا گیا۔ ہر وقت اداس اور کھویا کھویا۔ جیسے کسی نے معدے میں گھونسہ جما دیا ہے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولا۔

"قسمت۔"

کسی نے دلہن کا حال پوچھا تو ہونٹ چبا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے پوچھنے والے کی کنپٹی ادھیڑنے کے لیے کسی نکیلے پتھر کی تلاش میں ہے۔

تین مہینے اسی طرح گزر گئے کہ ایک روز گاؤں والے یہ خبر سن کر بھونچکا سے رہ گئے کہ سانولے کی دلہن روٹھ گئی——!

کیوں روٹھی؟

کب روٹھی؟

کہاں گئی؟

کیسے گئی؟

گاؤں کی بوڑھی دائی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور وہ ہر شخص کو یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی۔

"جانتی ہوں، پر بتاؤں گی نہیں، قرآن کی قسم کھائی ہے۔"

شکوک سے بھرپور دلوں میں ایک اور کانٹا کھٹک گیا۔ چوپال پر یہ ذکر آیا تو جعفر کے ابا جان حیران ہو کر بولے۔

"سانولا کہاں ہے؟"

"ہاں ہاں بھئی سانولا کہاں ہے؟" کسی نے تائید کی۔

چوکیدار کو اس کے گھر بھیجا گیا۔ مگر وہ پلٹ کر آیا تو وحشت زدہ سا، آنکھیں سرخ، ہاتھوں میں کپکپی، بولا۔

"سردار! وہ تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "دلہن کہاں گئی تیری؟ کہنے لگا "ہٹ تیری دلہن کی——" اور جھپٹا مجھ پر——وہ تو خیر گزری کہ اس کی جھولی سے لٹو گر پڑے، ورنہ——!"

"لٹو گر پڑے؟" جعفر کے ابا جان نے پوچھا۔ "لٹو کیسے گر پڑے۔"

ہانپتا ہوا چوکیدار بولا۔

"یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا تھا۔ وہ چھپر تلے بیٹھا لٹو گھما رہا تھا۔ اس کی جھولی میں بھی کئی لٹو تھے۔"

"لٹو تھے؟" جعفر کے ابا جان جیسے کسی اندھیرے غار میں گھس کر بھٹک گئے ہیں۔ "بلاؤ دائی کو"—— اور پھر اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں خود جاتا ہوں۔ آخر معاملہ کیا ہے۔"

چوپال والے منتظر بیٹھے رہے اور آخر جب جعفر کے والد واپس آئے تو بولے۔ "سانولے کا دماغ چل گیا ہے۔"

"اور دلہن؟" ایک نوجوان نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

جواب ملا۔ "بھئی میں یہ نہیں بتاؤں گا۔ قرآن کی قسم کھائی ہے!"

جعفر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنے والد سے انہی دنوں سارا

راز پوچھ لیا تھا۔ مگر جب میں نے اس سے تقاضا کیا تو بولا۔ "نہیں بھئی رہنے دو' مجبوری ہے۔ میں نے قرآن کی قسم کھائی ہے۔"

جعفر نے مجھے سانولے کے بارے میں اور بہت سی باتیں سنائیں کہ چند بیگھے زمین بیچارے کی ہے ہی۔ مزارعہ ہر سال کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے جس سے سال بھر گزر کر لیتا ہے۔ ہفتے عشرے کے بعد قصبے سے بہت سے لٹو خرید لاتا ہے اور بچوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ لٹو گھمانے میں ایسا طاق ہے کہ گھڑی سامنے رکھ لو' لٹو پانچ چھ منٹ تک تو گھومتا رہے گا۔ بچے اس سے خوش ہیں اس لیے اسے بالکل نہیں چھیڑتے۔ اور جو بچہ اس سے بہت ہل جائے اس پر تو قربان ہو جاتا ہے۔ اس سے بچوں کی طرح کھیلتا ہے اور گھوڑا بن کر اور اسے اپنی گردن پر بٹھا کر گلی گلی ہتھیلیاں اور گھٹنے چھیلتا پھرتا ہے۔ شام کو جھیوروں کے ہاں سے ایک دو روٹیاں لاتا ہے اور چنوں کی دال ابال کر نگل لیتا ہے۔ گرمی سردی میں اندر ہی سوتا ہے۔ شام کے بعد اس کے مکان سے اتنے تیز اور وحشت ناک قہقہے بلند ہوتے ہیں کہ اچھے اچھے حوصلہ مند نوجوان بھی اس کی گلی میں نہیں پھٹکتے۔ کہتے ہیں آسیب ہے' جن ہے۔

"مکان کہاں ہے اس کا؟" میں نے جعفر سے پوچھا۔

جعفر چائے لانے کے لیے اٹھتے ہوئے بولا۔

"ار بھئی رہنے بھی دو۔ ابھی کسی وقت وہ گلی سے گزرے گا تو دکھا دوں گا تجھے۔"

مگر میں مصر رہا کہ آج رات کو سانولے کے قہقہے سن کر ہی رہوں گا ——"ذرا دیکھیں تو سہی' یہ آسیب کیسا ہوتا ہے' کیسے شروع ہوتا ہے۔ کیسی

حرکتیں کرتا ہے۔ کیسے پیچھا چھوڑتا ہے۔ یہ تو ایک تجربہ ہے اور تم ڈاکٹر ہو۔ ایسے کیس تو ہر جگہ ملتے نہیں۔ تمہیں تو مطالعہ کرنا چاہیے اس کا——!"

جعفر بولا۔ "من من بھر کی گالیاں سن کر جو مطالعہ کیا جائے اس سے ہم محروم ہی بھلے۔ اس خدا کے بندے کو ذرا ٹکٹکی باندھ کر دیکھو تو وہ بکواس کرتا ہے کہ عورتیں تو انگلیاں ڈال لیتی ہیں کانوں میں——!"

مگر میں نے جعفر کو مجبور کر ہی لیا۔ شام ہوتے ہی وعدہ یاد دلایا۔ ہچکچاتا ہوا اٹھا' اور باہر آکر بولا۔

"تم سودائی ہو!"

مغربی دھند میں نیا نیا چاند یوں حیران کھڑا تھا جیسے چیل کا اکیلا پر کیکر کی ٹہنی میں اٹک گیا ہو۔ موہوم سی چاندنی نم آلود تھی۔ روئی روئی سی' جیسے شبنم کے چشمے میں نہا کر نکلی ہو۔ گلیاں چپ چاپ ہو گئیں۔ جیسے ان سے تاریکی نے زندگی چوس لی ہو۔ ہم دونوں ٹیڑھی بینکی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے سانولے کے مکان تک پہنچے۔ یہاں بھی جعفر نے مجھے روکنے کی کوشش کی' مگر اپنے شوق کو تشنہ رکھنے کا میں عادی نہیں' آخر سانولے کو کسی مقام سے دیکھنے کی تلاش ہوئی' مگر بے سود۔ دروازہ بند تھا اور دالان چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔

"چھت میں سوراخ ہوگا!" میں دیہات کے فن تعمیر کے بارے میں حاصل کی ہوئی نئی نئی معلومات کو بروئے کار لایا۔ "میں نے اس گاؤں کی ہر چھت میں سوراخ دیکھا ہے۔"

جعفر نے میری تائید کی۔

ایک چھوٹی دیوار پر چڑھ کر ہم بڑی مشکل سے منڈیر کے سہارے چھت پر آئے سانولے کے دالان میں جھینگروں نے ادھم مچا رکھا تھا اور چھپر تلے کبھی کبھی دو جگنو ٹمٹما جاتے تھے۔ ہم نہایت آہستہ آہستہ کنارے کنارے

چلتے چھت کے وسط میں پہنچے۔ بڑی احتیاط سے آگے سرک کر میں نے چپکے سے ایک ٹوٹا ہوا سرپوش اٹھایا——— چھت میں ایک بہت کھلا سوراخ تھا۔

"بھئی تمہی دیکھو۔" جعفر پیچھے ہٹ کر بولا۔

میں نے نیچے جھانکا۔ دیئے کی روشنی میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ بوڑھا ضعیف سانولا ایک کھاٹ پر بت بنا بیٹھا تھا کہ اچانک اس نے اپنا چولا اتارا۔ تہمد کو اڑس کر لنگوٹی سی بنائی اور پھر اپنے بازوؤں اور رانوں کو زور زور سے تھپتھپایا اور سینہ تھپکا کر ادھر ادھریوں ٹہلنے لگا۔ جیسے کسی کو اپنے جسم کے فولادی پن اور اپنے پٹھوں کی سختی کا یقین دلانا چاہتا ہے۔ "کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟" وہ ایک جگہ رکتے ہوئے ہوا میں گھور کر بولا۔ اور پھر اچانک ایک کونے سے لٹو اٹھا لایا۔ اس کا دھاگا لپیٹا' اکڑوں ہو کر کھاٹ کے نیچے سے ایک صندوقچہ کھینچا اور اسے کھول کر آس پاس دیکھا۔ مجھے صندوقچے میں روئی کی تہ پر ایک لمبا سا منحنی بھورا دھبہ نظر آیا جس پر ہاتھ پھیر کر سانولا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور لٹو کو تان کر بولا۔

"روٹھ گیا——— روٹھ گیا تو——— لٹو گھماؤں' گھماؤں لٹو؟"

اور پھر نہایت زور سے ہنس کر اس نے فرش پر لٹو پھینکا۔

"کیسے گھومتا ہے——— جیسے سو گیا ہے بے چارا——— بالکل نہیں گرے گا۔ جب تک تو نہیں کہے گا' لٹو نہیں گرے گا——— اچھا ہے نا لٹو ——— کیوں ننھے؟"

یہاں سے سانولا غضب ناک ہو گیا۔

"ابے کچھ منہ سے پھوٹ بھی جاگیردار کے پٹھے——— بکتا کیوں نہیں ——— ہیں؟ اُس وقت تو تین مہینوں ہی میں اتاولا ہو گیا اور اب منہ سی لیا ہے سالے۔ ابے کچھ بول بھی تیری ماں———!"

ایک گرجتی ہوئی گالی دے کر سانولے نے انتہائی غصے میں ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے کسی کو گردن سے دبوچنے والا ہو۔ باہوں کی کمانوں کو اکڑا کر استخوانی انگلیوں کو تان کر وہ ہولے ہولے صندوقچے کے منحنی بھورے دھبے کی طرف بڑھا۔ ساتھ ساتھ اس نے آسیب زدوں کے سے قہقہے لگانے شروع کئے۔ ان قہقہوں میں قہقہہ کم تھا۔ چیخیں اور کراہیں زیادہ تھیں۔ وہ جبڑے پھاڑے گھٹنوں کے بل بیٹھا انگلیوں کے شکنجے کو صندوقچے کے قریب لا چکا تھا ——— اور لٹو اسی طرح گھوم رہا تھا' جیسے سو گیا تھا بے چارا۔

معاً جھپٹ کر اس نے بھورے دھبے پر انگلیاں گاڑ دیں۔ لٹو ڈولنے لگا۔ اور میں نے وحشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹنا چاہا۔ مگر ٹھنن سے کہنی سرپوش سے ٹکرا گئی۔ اچانک سانولے نے پینترا بدلا۔ صندوقچے کا ڈھکنا کھٹاک سے بند کر کے اسے کھاٹ کے نیچے دھکیل دیا۔ اور اوپر دیکھا اور پھر پاؤں کے انگوٹھوں پر کھڑے ہو کر پوری شدت سے چیخا۔

"ہت تیرے دیکھنے والے کی۔"

جعفر اور میں چھت پر سے کود کر گلی میں آرہے۔ دور روئی کی سی نرم اور سفید دھند میں لپٹا ہوا بھورا منحنی چاند مغربی افق پر گر پڑا تھا اور تارے جھنجلا سے رہے تھے۔

شعلہ نم خوردہ

گاؤں سے اتر کر سرکاری راکھ کے پرلے کنارے پر اس کی نانی اماں رہتی تھی۔ اس کا ماموں فوج میں بھرتی ہو کر مصر چلا گیا تھا اور اس کی ممانی قصبے کے خیراتی ہسپتال میں کمر کے درد کا علاج کرا رہی تھی۔ وہ ایک بار ممانی کو ہسپتال میں ملنے بھی گئی، جس نے اس کی آمد پر خواہ مخواہ باچھیں پھیلا کر پیلے دانت دکھانے کی کوشش بھی کی اور اسے ایک اکنی بھی دی کہ وہ ہسپتال سے باہر والی دکان سے عربی کھجور خرید کر کھالے، مگر جب نانی اماں کا ذکر آیا تو اس نے ہونٹ سکیڑ کر ناک بھوؤں کی طرف اچھالی اور آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"مزے سے پڑی ہو گی کھاٹ پر۔ جیواں پڑوسن سے اس کی بہت گاڑھی چھنتی ہے، وہی کھانے پینے کا بندوبست کر دیتی ہوگی۔ اسّی سال کی عمر ہے اور آنکھ تک نہیں آئی اس کی۔ اور ہم پچیس سال کے سن میں کُبڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے بیٹی۔ سنا تیری ماں کیسی ہے آج کل ——— سنا ہے پچھلے دنوں اس کے ہاتھ پیر سوج آئے تھے۔"

اسے اپنی نانی اماں سے محبت تھی اور ممانی کی زبان سے ایسے جلے کٹے طعنے سن کر وہ ممانی سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس کے کانوں کی لٹکتی ہوئی لوؤں میں بڑے بڑے سوراخ، اس کے منہ کی چھائیاں، اس کے ناخنوں کا میل، اس کے پسینے کی بدبو ——— وہ ممانی کے پاس بیٹھ نہ سکی اور ماں کے کہنے کے خلاف

وہاں رات بسر کرنا بھی برداشت نہ کر سکی۔

وہ کئی مرتبہ کوٹلی میں نانی اماں کو ملنے گئی تھی۔ اس کے پہنچتے ہی اس بڑھاپے کے عالم میں بھی وہ لاٹھی ٹیکتی اڑتی پھرتی۔ "یہ چیز پکاؤ، وہ چیز تیار کرو۔ پانی ٹھنڈا ہو میری مریاں کے لیے۔ دیکھو یہ پنکھا ٹھیک نہیں۔ وہ ننھی سی نازک سی کالا باغ والی پنکھی کہاں ہے ——— وہ رہی ———!"

اور پھر وہ مریاں کے قریب بیٹھ کر ہلکی پھلکی پنکھی کو مرجھائی انگلیوں میں گھما کر کہتی۔

"میں بیٹی کے پنکھا جھلوں!"

اور بیچاری مریاں کے رخسار پکے ہوئے بیروں کی طرح لال پڑ جاتے۔ آنکھیں جھپکا کر انگلیاں چٹخاتی، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیتی۔ پہلو بدلتی اور کہتی۔

"نانی اماں! تم خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ تم میرے پنکھا جھلو ——— میں ڈوب نہ مروں حیا سے؟"

بڑھیا مسرت سے ہانپنے لگتی۔ مریاں کی بلائیں لیتی۔ اس کے آوارہ بالوں کی لٹیں اس کے کانوں کے پیچھے جماتی۔ اس کے جھومر اور بندوں سے لٹکے ہوئے نقرئی پتروں کو ترتیب دیتی اور پھر اس کا دوپٹہ تھام کر پکارتی۔

"اے بہو رانی! میری مریاں کا دوپٹہ دیکھا تو نے، کتنا نرم ہے، کتنا ہلکا ہے۔ گلاب کا پھول کیا چیز ہے اس کے سامنے۔"

مریاں کی ممانی چولھے میں بغیر ضرورت کے بہت سے اپلے گھسیٹر کر کہتی۔

"اچھا ہے۔ میں نے بھی اوڑھا تھا اسی قسم کا، پہلی دھلائی میں چھلنی ہو جاتا ہے۔ کم بخت۔ ٹڈیوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔"

مریاں جانتی تھی کہ اس کی ممانی جھوٹ کہہ رہی ہے۔ لیکن خاموش ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی ممانی کے غصے کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں مشہور تھیں۔ ایک بار وہ اپنے شوہر سے جھگڑی اور غصے میں اپنے ننھے کا گلا دبانے پر تل گئی۔ ایک مرتبہ بڑھیا کے ہاتھوں سے چوبی چمچہ ٹوٹ گیا اور اس نے گھر بھر کے سارے چمچے اکٹھے کر کے انہیں دیا سلائی دکھانا چاہی۔ مریاں مفت میں عذاب کیوں مول لیتی' اس نے اگر ایسا دوپٹہ اوڑھا ہے تو اسے کیا۔ اوڑھا ہو گا' لیکن مریاں کی نانی اماں بہو کی باتیں سن کر اپنے کیڑوں کے سے ہونٹ کاٹتی اور لاٹھی کو زمین سے ٹکرا کر کہتی۔

"تو نے کب اوڑھا ایسا دوپٹہ؟"

"تجھے یاد نہیں۔" بہو رانی ہنڈیا کو بلاوجہ چھلکا کر کہتی اور مریاں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتی۔ اسے ممانی کے جھوٹ اور گھبراہٹ پر ہنسی آتی۔ نانی اماں کے غصے پر ہنسی آتی۔ وہ اندر ہی اندر گنگتی رہتی اور نانی اماں دیر تک چہرے کی گہری جھریوں سے پسینہ پونچھ کر انگلیوں کی ناہموار پوروں پر میلے میلے قطرے اکٹھے ہوتی دیکھتی اور ہولے سے کہتی۔

"جھوٹ بکتی ہے۔' دیکھو بیٹی! تیرے ایسا دوپٹہ لاہور والوں نے بھی نہیں اوڑھا۔"

دوپٹہ تو خیر جو کچھ تھا وہ مریاں جانتی تھی لیکن نانی اماں کی محبت اس کے دل میں گھر کر چکی تھی اور اب جبکہ مریاں کی ممانی ہسپتال میں تھی اور نانی اماں گھر میں اکیلی رہ گئی تھی' مریاں اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ ہفتہ بھر کے لیے کوٹلی چلی جائے اور اس کی جی بھر کر خدمت کرے۔ لیکن اس کے دونوں بھائی فوج میں بھرتی ہو کر منی پور پہنچ چکے تھے۔ اس کا باپ ایک بلوے کے مقدمے میں گرفتار ہو کر دو سال کی قید بھگت رہا تھا اور اس کی ماں کی دیکھ بھال کے لیے

کوئی ایسی ہمدرد پڑوسن بھی تو نہیں تھی جو کنوئیں سے پانی بھر لاتی' دو وقت کھانا پکا دیتی اور پھر اس کی کالی گائے اور بھوری بکری اور شریر مرغیاں!

لیکن ایک روز جب وہ آنگن کے شیشم کے نیچے بیٹھی ماں کے پرانے چولے کی مرمت کر رہی تھی اور اس کی ماں اندر ایک چولھے کو تازہ مٹی سے لیپ رہی تھی تو سامنے گلی سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت سر پر ایک بہت بڑی گٹھڑی اٹھائے گزری۔ پسینے کی ایک نہ ختم ہونے والی دھار اس کی ٹھوڑی سے گزر کر اس کے کالے چولے کو بھگوئے جا رہی تھی۔

وہ پلٹی اور آنگن میں مریاں کے قریب آ کر بولی۔

"بیر لو گی بیٹی؟"

"بیر——" مریاں بولی—— "ہے امی تازہ بیر لے لوں—— بکاؤ ہیں؟"

"کیا بھاؤ ہے؟" چولھے کے قریب سے آواز آئی۔

بیر بیچنے والی پکاری۔

"پیسے کی چار مٹھیاں۔"

"پانچ دو گی؟"

"نہیں بڑی بی' پہاڑیوں اور کانٹے والی جھاڑیاں پر چڑھتے چڑھتے ہاتھ پیر چھلنی ہو رہے ہیں۔ بیر اکٹھے کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اِدھر تیری پڑوسن کو بھی چار ہی مٹھیاں دی ہیں!"

"ساڑھے چار؟"

"ہاں ہاں خالہ—— ساڑھے چار مٹھیاں۔" مریاں نے چولا چٹائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

اور بیر بیچنے والی گٹھڑی کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"لے اب ذرا تھام گٹھڑی کو۔ ساڑھے چار ہی لے لو' پر کسی کو بتانا نہیں' میں لٹ جاؤں گی!"

بیر جھولی میں ڈالتے ہوئے مریاں بولی۔

"کہاں کی رہنے والی ہو خالہ؟"

کوٹلی کی!"

"کوٹلی کی؟" مریاں پکاری۔

اور مریاں کی ماں مٹی سے لت پت ہاتھ جھٹکتی اٹھی۔

"کوٹلی کی؟"

اور جب اس طرف آکر بڑھیا کو دیکھا تو پکار اٹھی۔

"ہائیں! بہن بھاگ بھری!"

بیر بیچنے والی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تم یہاں رہتی ہو بہنو! قرآن کی قسم میں نہیں جانتی تھی—— لے بیٹی—— یہ پیسہ واپس لے لے۔ میں اپنوں سے سودا کرتی پھروں—— توبہ—— لے اور بیر لے' جھولی ادھر کر' ماں کی طرف دیکھتی ہے؟ ادھر لا جھولی!"

اور مریاں کی جھولی میں اس قدر بیر ڈال دیئے گئے کہ وہ جھک سی گئی۔

"مجھے تو تم سے ایک ضروری بات کہنی تھی۔ میں نے کہا چلو آگے جا کر نوراں دھوبن سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھ لوں گی۔ تمہاری ماں آج کل بیمار ہے۔ بیٹھے بیٹھے کھانستی ہے تو گٹھڑی بن جاتی ہے' بیچاری کے منہ سے بلغم پونچھنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ میری بیٹی کو کہنا مریاں کو یہاں بھیج دے اور ساتھ ہی مرغیوں کے جتنے انڈے مل سکیں وہ بھی لیتی آئے۔ اسے

ایک دوا بنانی ہے۔ بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ کہتی تھی آج ہی مریاں کوٹلی چلی جائے۔"

"امی بیمار ہے؟" مریاں کی ماں خوفزدہ آواز میں بولی۔

"نانی اماں بیمار ہے؟" مریاں بیروں بھری جھولی سنبھال کر بولی۔ "امی چلی جاؤں آج؟"

اسی وقت گاؤں سے مرغیوں کے انڈے جتنے ملے' جس قیمت پر ملے' جہاں سے ملے' مریاں کے بھائی کے خاکی تھیلے میں جمع کر دیئے گئے۔ اور جب سائے کافی ڈھل گئے تو مریاں تیار ہو چکی تھی۔ اس کی ماں نے اسے بے شمار ہدایات دیں۔ بوڑھے لوگوں کی تیمار داری کے طریقے سمجھائے۔ پڑوسن سے ہنسی مذاق سے منع کیا۔ پردیس کے پنگھٹ پر پانی بھرتے وقت دوپٹے سے اپنا سارا جسم ڈھانکنے کی تلقین کی۔ اور جب مریاں خاکی تھیلا ہاتھوں میں لٹکائے گھر سے نکلی تو اس کی ماں چھت پر چڑھ گئی اور سرکاری راکھ میں گھستی ہوئی پگڈنڈی پر بہت دیر تک مریاں کو دیکھتی رہی۔ مریاں تیز تیز قدم اٹھائے جا رہی تھی اور جب اس نے سرکاری راکھ میں قدم رکھا اور ڈھلانوں سے اترنے لگی تو بالکل ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی انڈوں سے بھرا ہوا تھیلا کچھ اس طرح تھامے ہوئے تھی کہ انڈے ادھر ادھر بالکل نہ کھسکے۔ یونہی گھومتی پھرتی راہوں میں وہ کنکر اڑاتی' گنجان درختوں کی جھکی اور پھیلی ہوئی شاخوں سے بچ کر دامن سمیٹتی جب وہ ایک برساتی نالے کے قریب پہنچی تو اچانک بوندیں پڑنے لگیں۔ وہ گھبرا کر رک گئی اور اوپر دیکھا۔ گہرے کالے بادل آوے کے دھوئیں کیطرح امڈے آرہے تھے اور بہت دور کہیں سے کڑک کی گونج بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے چار کوس طے کئے تھے اور ابھی چھ کوس باقی تھے۔ بوندیں تیز ہو رہی تھیں۔ ذخیرہ کے درختوں نے دم سادھ لیا تھا۔

پگڈنڈی کی مٹی پر بوندیں چیچک کے سے داغ ڈال رہی تھیں۔ مریاں کا چولا بھیگ کر اس کے جسم سے چمٹ گیا تو اس نے دوپٹے کی دو تہیں بنائیں اور اسے سینے پر پھیلا لیا۔ لیکن بوندیں اس سے بھی پار ہو گئیں۔ تنہائی کے باوجود وہ اپنی نیم عریانی پر شرمانے لگی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر تھیلے کو سینے پر لے آئی اور اِدھر اُدھر دیکھا' بہت اونچی کالی پہاڑیوں کے پس منظر پر تیز بوندیں تنے ہوئے دھاگوں کی طرح کانپ رہی تھیں اور آس پاس بے ڈھب پتھروں کے نیچے عجیب الخلقت مکوڑے رینگنے لگے تھے۔ وہ گھبرا کر آگے کو جھکی ہوئی چٹانوں کی تلاش میں نالے کے کنارے کنارے بھاگنے لگی۔ اسے ایک چٹان مل گئی لیکن معاً" اسے خیال آیا کہ وہ برساتی نالے میں کھڑی ہے۔ ابھی یہ نالا گرجتا ہوا چڑھے گا اور چٹانیں وٹانیں سب ڈوب جائیں گی۔ وہ ایک جست بھر کر کنارے پر آ گئی۔ تھیلے میں انڈے بج اٹھے۔ وہ ہانپتی ہوئی درخت کے کسی موٹے تنے کی تلاش میں تھی کہ کچھ دور ایک جھکی ہوئی چٹان کے سائے میں اسے ایک نوجوان بیٹھا نظر آیا۔ وہ بوندوں سے بالکل محفوظ تھا۔ جھکا ہوا ایک پوٹلی کھولنے میں مگن تھا۔ اس کے قریب ایک بکرا بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔

مریاں پہلے تو کچھ ہچکچائی۔ تھیلا سینے سے لگا لیا۔ پنڈلیوں سے چمٹی ہوئی چادر جو کچھ اوپر اٹھا رکھی تھی' چھوڑ دی اور ننھے ننھے سنگریزے اس کے کنارے سے لپٹ لپٹ کر ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ بارش تیز ہو رہی تھی اور اب اس کی نگاہیں بہت دور تک نہیں جا سکتی تھیں۔ وہ ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہی تھی۔ تھیلا کپکپا رہا تھا۔ اور اب برساتی نالے میں کچھ پانی بھی بہنے لگا تھا۔

وہ سمٹتی ہوئی اس چٹان کے قریب پہنچی تو نوجوان نے پلٹ کر نگاہیں اٹھائیں اور مریاں کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولا۔

"ارے!"

"بیٹھ جاؤں ادھر؟" مریاں جیسے کسی شہنشاہ کے محل میں قدم رکھ رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے کہا۔ "یہ زمین سب کے لیے ساجھی ہے۔"

مریاں نے نہایت احتیاط سے تھیلا ایک طرف رکھ دیا۔ اور چٹان سے قریباً" چمٹ گئی۔ اب وہ بارش سے بالکل محفوظ تھی۔ لیکن ایک غیر شخص کی موجودگی تیز بارش سے بھی بڑا عذاب ثابت ہوئی۔ اس کی نسیں کھچ گئیں اور مٹھیوں میں کھجلی سی ہونے لگی۔ چٹان کا مس بچھو کا ڈنک معلوم ہوا۔ بکرا اسے یوں غور سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بے بسی کو سمجھ چکا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ نوجوان کی طرف نہ دیکھے لیکن یونہی ایک بار اس کی پلکوں سے ایک نگاہ چھن کر نوجوان پر جا پڑی جو پوٹلی کھول کر چنے چبا رہا تھا اور دور برساتی نالے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے گھوم کر پوٹلی آگے بڑھا دی اور بولا۔

"کھاؤ۔"

مریاں کا دل دھڑاک سے جیسے رک گیا۔ کئی بل کھا گئی' جیسے سانپ کی طرح چٹان کے نیچے تیر جانا چاہتی ہے۔

"مٹھی بھر تو لے لو' ٹھنڈ اور بارش میں چنے بڑا مزہ کرتے ہیں۔"

اس نے مٹھی تو بھر لی' لیکن انگلیوں کی گرفت بہت ڈھیلی تھی۔ صرف پانچ سات دانے اٹھا سکی' اور ہونٹوں کو نیم وا کر کے ایک دانہ بہت چابکدستی سے زبان پر پھینک دیا اور جب اسے چبایا تو واقعی بڑا مزہ آیا۔ ساری ٹھنڈ اتر گئی اور کپکپاتے ہوئے جبڑوں میں قوت سی آ گئی۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟" نوجوان نے بے توجہی سے چنے چباتے ہوئے پوچھا۔

مریاں نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔

"کہاں جاؤ گی؟"

"کوٹلی!"

"وہاں کون رہتا ہے تمہارا؟"

"نانی اماں!"

"دیر سے چلی ہو؟"

"نانی اماں نے ابھی ابھی کہلوا بھیجا ہے کہ میں بیمار ہوں' مجھے انڈے پہنچا جاؤ دوا کے لیے۔ یہ انڈے لیے جا رہی ہوں اس کے لیے!"

نوجوان نے زور سے قہقہہ لگایا۔

اور مریاں گھبرا سی گئی۔

آخر ہنسنے کا یہ کونسا محل تھا۔

"عجیب بات ہے!" نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں بھی نانی اماں کے ہاں ہی جا رہا ہوں۔ وہ بھی بیمار ہے' تم اپنی نانی اماں کے لیے انڈے لیے جا رہی ہوں اور میں ——— یہ بکرا ——— دوا کے لیے!"

مریاں نے مسکرا کر گردن ایک طرف جھکا دی اور بکرے نے جگالی کرتے ہوئے دونوں ہونٹ اوپر چڑھا کر کچے تربوز کے بیجوں کے سے دانت نکالے اور مریاں ہنسی۔

"تمہارا بکرا آدمیوں کی بولی سمجھتا ہے۔"

نوجوان ہنس دیا۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

نوجوان نے اپنے گاؤں کا نام بتا دیا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

"نمل!"

"وہاں کون رہتا ہے تمہارا؟" اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں ہاں تمہاری نانی اماں رہتی ہے وہاں۔ نمل یہاں سے کے کوس ہے؟"

"دس کوس!"

"بہت دور ہے!"

"بارش نہیں تھم رہی!"

"ہاں برسے ہی جا رہی ہے!"

"رات کہاں کاٹیں گے؟"

"رک جائے گی بارش!"

"اگر نہ رکی؟"

"تو یہیں!"

لیکن یہ الفاظ کہنے کے بعد اچانک مریاں کے دل میں جیسے نشتر سا چبھ گیا۔

یہیں ——— یعنی اسی تنگ سی جگہ میں! اس سنسان ویران جنگل میں! رات کے وقت ——— غیر آدمی کے ساتھ ——— نہیں۔

نوجوان نے پوٹلی باندھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا شام کا کھانا ہے۔ شام پڑے کھائیں گے۔"

"ہوں!"

"نالا چڑھ آیا ہے۔"

"ہوں!"

"بارش رکی تو چند گھڑیوں کے بعد یہ بھی اتر جائے گا۔"

"ہوں۔"

"تمہاری نانی اماں کے بَرس کی ہیں؟"

"اسّی برس کی!"

نوجوان پھر زور سے ہنسا۔

"عجیب بات ہے، سب لوگوں کی نانیوں کی عمر اسّی برس ہی ہوتی ہے!"

مریاں مسکرائی۔

اب بارش نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ بکرا گھبرا کر نوجوان اور مریاں کے درمیان دبک گیا اور مریاں کے پہلو میں اپنا سر گھسیڑنے لگا۔ نوجوان نے بکرے کو اپنی طرف کھینچا اور مریاں بکرے کے ننھے ننھے سینگوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"کیا کہتے ہو بے چارے کو، بیٹھا رہے، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔"

نوجوان کی آنکھیں مسکرائیں۔

"تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"قید ہے!"

"قید ہے؟"

"ہاں قید ہے ـــــ بلوا ہوا تھا ایک برچھا ہاتھ میں آگیا اور ایک شخص کی ران کاٹ دی ـــــ تمہارا باپ؟"

"ہل چلاتا ہے!"

"تم خود؟"

"میں بیکار ہوں!"

"فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔"

"بچپن میں بازو ٹوٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر نکال دیتا ہے۔ کہتا ہے کہنی پر گانٹھ پڑ گئی۔" اور اس نے اپنی کہنی ٹٹولی۔

"پولیس میں ہو جاؤ۔"

"میں پولیس سے گھبراتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"گنہگاروں کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ بیکسوں اور بے گناہوں پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرا ایک دوست ہے دھوبی، بڑا اچھا گبھرو۔ بڑی اچھی کبڈی کھیلتا ہے۔ ایک بار کبڈی کے میلے میں سے گھسیٹ کر لے گئے اسے بیگار پر۔ تھانیدار کے لیے ایک کتا لانا تھا گوہلاں سے، میں میلے میں موجود نہیں تھا، ورنہ الجھ پڑتا پولیس سے۔! حوالات میں جاتا مگر ایک دو کے جبڑے تو دھن ڈالتا۔ ایک دو کی پسلیاں تو چٹخاتا۔ بہت غصہ آتا ہے مجھے ان جنگل کے داروغوں، پولیس کے سپاہیوں اور ان ذیلداروں نمبرداروں پر ـــــ ان سے کوئی پوچھے آخر غریب کا گھر تاکنے میں کونسی جوانمردی ہے، ذرا ہم جیسوں سے بات کریں تو چھٹی کا دودھ یاد دلادیں کمبختوں کو!"

مریاں، نوجوان کے اکڑے ہوئے بازوؤں اور لال چہرے کو دیکھ کر مرعوب سی ہو گئی۔

"قرآن کی قسم کوئی اجنبی بھی مجھے کہے کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور فلاں نے یہ ظلم کیا ہے، تو مجھے ایک گھڑی چین نہیں آتا۔ اسی لیے کئی بار الجھا ہوں علاقے کے سفید پوشوں سے۔ پچھلے دنوں ہمارے گاؤں کے ایک چمار سے ہسپتال والے ڈاکٹر نے بیس روپے کا جوتا مفت لے لیا۔ صرف اسی لیے کہ اس کی بیوی کو کمر کے درد کی شکایت تھی، اور وہ ہسپتال میں تھی۔ بڑا اندھیر مچ رہا ہے یہاں۔ سوچتا ہوں بس چلے تو سرکار کے آگے ان سب دوہری ٹھوڑیوں کی

قلعی کھول دی!"

مریاں نوجوان کی نرم دلی کو جی ہی جی میں سراہ رہی تھی اور آنکھوں میں چمک اور رخساروں پر خون آجانے سے وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اچانک وہ باہر جھانک کر بولا۔

"بارش تھم گئی!"

"تھم گئی؟" اور مریاں نے باہر جھک کر آسمان کی طرف دیکھا۔

"بادل چھٹ گئے۔"

"ہاں چھٹ رہے ہیں۔"

"دن چھپنے میں ابھی بہت دیر ہے۔ وہ بادل گزر رہے ہیں سورج پر سے ــــ!"

"کہاں؟" مریاں باہر نکل آئی۔

"وہ ــــ سامنے سیدھے درخت کی دائیں طرف کی ٹہنی کی آڑ میں!"

"ہاں ہاں ــــ ابھی بہت وقت ہے۔"

"چلیں؟"

"چلو!"

"پر تم تو اُدھر اتر کر پگڈنڈی پکڑو گی!"

"ہاں!"

"اور میں ذرا اس طرف کو مڑ جاؤں گا' نمل اُدھر ہے نا۔"

"اچھا!"

"نالہ بھی اتر رہا ہے۔"

"تھوڑا سا پانی باقی ہے۔"

"یہ بھی بہہ جائے گا۔"

"پر پانی میں سے گزرنا ضرور پڑے گا۔"

"میرے ساتھ آؤ' میں تمہیں پار پہنچا دوں!"

"اور بکرا؟"

"کاندھے پر!"

"میرے پاس انڈوں کا تھیلا بھی ہے؟"

"وہ دوسرے کاندھے پر ــــ لیکن میرا خیال ہے پانی اتنا گہرا نہیں۔"

اور جب نوجوان نے بکرا اپنے کاندھے پر لٹکا سا لیا اور مریاں تھیلے کو سینے سے چمٹاتی باہر آئی اور جب دونوں نالے کے قریب پہنچے تو اچانک نوجوان نے بکرا اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا اور پوٹلی کھولتے ہوئے بولا۔

"بھول گیا میں۔ لو یہ تھوڑے سے چنے اپنے پاس رکھ لو' راہ میں کام آئیں گے۔"

اور پھیلی ہوئی پوٹلی سے مریاں نے بہت سے دانے اٹھا کر بھیگے ہوئے آنچل میں ڈال لیے۔ اس کی کنپٹیاں بج اٹھیں اور سامنے برساتی نالے کی کف آلود سطح پر اسے عجیب عجیب سے رنگ برنگے سائے تھرکتے دکھائی دیئے۔ اس نے ایک بہت گہری سانس لی اور نوجوان کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو' بھئی تم کتنے اچھے ہو!"

اور جب دونوں نے نالے میں قدم دھرا تو نوجوان نے مریاں سے تھیلا لے کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ وہ آگے بڑھ گیا اور مریاں نے جب پانی سے بچنے کے لیے پنڈلیوں پر سے چادر اٹھائی تو اسے نوجوان کے آگے بڑھ جانے کی وجہ معلوم ہوئی۔ کتنا شریف اور بہادر اور خاندانی ہے یہ مسافر۔ مریاں نے

جی میں سوچا۔

پانی گھٹنوں گھٹنوں تھا۔ نوجوان جب پرلے کنارے پر پہنچا تو سامنے ہی دیکھتا رہا اور بکرے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور جب مریاں پانی سے نکل کر اس کے قریب آئی تو وہ پلٹا اور تھیلا تھما کر بولا۔ "اچھا۔"

"جیتے رہو۔" مریاں کے لبوں سے یہ الفاظ بے ارادہ نکل گئے۔

نوجوان مسکرایا اور بکرے کو گردن پر اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا سامنے ایک موڑ پر غائب ہو گیا اور مریاں نے منہ میں دو چار چنے ڈال کر ایک بہت گہری سانس لی اور اپنی پگڈنڈی پکڑ لی۔

راستے میں اس نے بڑی مزے مزے کی باتیں سوچیں۔ بالکل ان ہونی باتیں! ریت کے محل! وہ کوئی ایک کوس گئی ہو گی کہ سامنے ایک اونچے درخت کے قریب اسے تین شہری کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے سروں پر انگریزی ٹوپ پہن رکھے تھے اور پاؤں میں لمبے لمبے برساتی بوٹ تھے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور گاہے گاہے ادھر ادھر دیکھ کر پہاڑوں کے دروں کی طرف اشارہ کر دیتے تھے اور جب مریاں ان کے قریب پہنچی تو ان میں سے ایک شخص اپنی عینک کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"کہاں جائے گی لڑکی؟"

"کوٹلی!"

"یہاں سے کے کوس ہے یہ گاؤں؟"

"کوئی پانچ کوس!"

"کیا تو بتا سکتی ہے کہ کوٹلی سے ہمیں بیس تیس مرغ مل جائیں گے اس وقت——— اور سو دو سو انڈے؟"

"انڈے؟" مریاں نے پوچھا اور خاکی تھیلے کو ایک ہاتھ سے دوسرے

ہاتھ میں منتقل کر دیا۔

عینک والا شخص نتھنے چڑھاتا آگے بڑھا اور خاکی تھیلے کو چھو کر بولا۔

"اس میں کیا ہے؟"

"انڈے!" مریاں کا ماتھا تپ گیا اور آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"ادھر دکھاؤ" اس نے تھیلا مریاں کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے کھول کر بولا۔ "کتنے ہوں گے؟"

"جی کوئی ساٹھ ستر!" وہ دونوں ہاتھ ملتی ہوئی بولی۔

"کیا قیمت ہے ان کی؟"

"قیمت؟" دوسرا شخص جس کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت کا ایک لوتھڑا سا لٹک رہا تھا آگے بڑھ کر بولا۔ "قیمت ویمت کیسی——— جا لڑکی اپنی راہ لے' یہ انڈے ایک بڑے افسر نے مانگے ہیں۔ اس افسر کا کہنا نہ مانا جائے تو قید کرا دیتا ہے۔"

"پر میری نانی اماں بیمار ہے اور میں نے———"

نانی اماں کا لفظ سنتے ہی سب یوں منہ پھاڑ کر ہنسے کہ ان کے ٹوپ گردنوں پر ڈھلک گئے اور دوہری ٹھوڑی والا بولا۔

"تیری نانی اماں کے صدقے' ہمارے افسر کا پیٹ بھر جائے تو کیا حرج ہے!"

"پر میرے بھیا کا تھیلا——— " مریاں نے بلکتے ہوئے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر فریاد کی۔

"پارسل کر دیا جائے گا!" دوہری ٹھوڑی والا بولا اور ان کے کرخت قہقہوں سے پہاڑیاں جیسے پھٹ سی گئیں اور مریاں کے کانوں کے پردوں پر تپتی ہوئی سلاخیں سی رینگنے لگیں۔

سر پر ہاتھ باندھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر روتی رہی۔ اسے کئی بار اپنی نانی اماں ہچکیاں لیتی اور کھاٹ پر بل کھاتی نظر آئی اور کئی مرتبہ اس نے یوں محسوس کیا جیسے اچھے خدا نے آسمان سے بے شمار مرغیاں اتاری ہیں۔ انہوں نے پر پھیلا کر انڈے دیئے ہیں اور اب اس کے پاس اس قدر انڈے اکٹھے رکھے ہیں کہ وہ انہیں اٹھا تک نہ سکے گی لیکن جلد ہی انڈے گول گول سنگریزوں میں تبدیل ہوگئے۔ اٹھ کر اس نے کوٹلی کا رخ کیا مگر رک گئی۔ وہ خالی ہاتھ نانی اماں کے ہاں کیسے جائے۔ نانی اماں اس کی باتیں کب مانے گی۔ سمجھے گی انڈوں پر رقم خرچ کرنے سے ڈر گئے' اور اب بہانے تراشتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ مجھے کوٹلی نہیں جانا چاہئے ــــــ اور اس نے اپنے گاؤں کی راہ لی۔ اس کی پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک سی گئی تھیں' اور پتلیوں پر پانی کا پردہ سا پڑ گیا تھا۔ اس کی بھوؤں کی جڑوں میں چبھن سی ہو رہی تھی اور ہونٹ یونہی کبھی کبھی کپکپا اٹھتے تھے۔ روتی سسکتی وہ برساتی نالے کے قریب پہنچی۔ پانی بہت تھوڑا سا رہ گیا تھا۔ وہ بغیر چادر اٹھائے نیچے پانی میں بے شمار گول گول سنگریزوں کو دیکھتی جب کنارے پر پہنچی اور اوپر دیکھا تو سامنے وہی نوجوان کھڑا تھا۔ لال لال آنکھیں۔ عجیب سی مسکراہٹ۔

"لوٹ آئیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیوں؟"

"افسروں نے انڈے چھین لیے!"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے اور پھر مریاں بولی۔

"تم بھی لوٹ آئے؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"افسروں نے بکرا چھین لیا!"

"انکار کر دیا ہوتا!"

"کیا تھا پر اس انکار کا یہ جواب ہے!" اور اس نے گھوم کر پیٹھ پر سے چولا اٹھایا۔ سانولی جلد پر نیلی نیلی ڈانڈوں کا جال سا بچھا ہوا تھا ــــــ اور کہیں کہیں سے خون رس کر جم گیا تھا۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر مریاں نے اپنا آنچل پھیلا کر کہا۔

"چنے کھاؤ۔"

اور نوجوان نے دو چنے منہ میں ڈالتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں سے اس کی آنکھوں میں شہاب ثاقب کی سی چمک پیدا ہوئی۔ اور پھر زمین کو گھور کر بولا۔

"اچھا ــــــ"